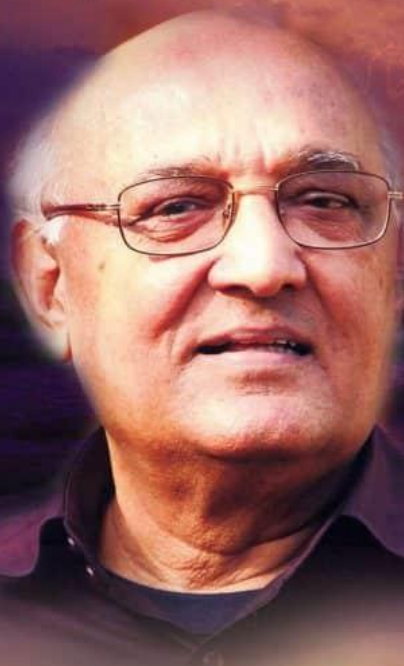


ہم اُس کے ہیں

کلیات — غزلیں



امجد اسلام امجد

غزلیں

سحرآثار

- ۲۱ ، حد سے توقعات زیادہ کیے ہوئے ،
- ۲۳ ، درو دیوار ہیں مکان نہیں ،
- ۲۶ ، کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا ،
- ۲۸ ، ہم تو ایسے خواب تھے تعبیر جو بھی تھی ،
- ۳۰ ، منظر کے ارد گرد بھی اور آ رہا دُھند ،
- ۳۲ ، اُداسی میں گھرا تھا دل چراغِ شام سے پہلے ،
- ۳۳ ، آنکھوں کا رنگ ، بات کا لہجہ بدل گیا ،
- ۳۴ ، آنکھوں کو اتنی اس بہت دیکھنے میں تھے ،
- ۴۰ ، ظاہرِ شمال میں کوئی تارا ہوا تو ہے ،
- ۴۲ ، الجھن تمام عمر یہ تارِ نفس میں تھی ،
- ۴۴ ، سب کی اک اوقات ،
- ۴۶ ، زمین جلتی ہے اور آسمان ٹوٹتا ہے ،
- ۴۸ ، کہتا ہے درپن ،
- ۵۱ ، کسی تریگ کسی سرخوشی میں رہتا تھا ،
- ۵۲ ، سب دیکھتے تھے اور کوئی سوچتا نہ تھا ،
- ۵۶ ، جب تک رستے جائیں ،

یہ بولتے ہوئے لمحے یہ ڈولتی ہوئی شام ، ۱۱۷
 کلام کرتی نہیں بولتی بھی جاتی ہے ، ۱۱۹
 لبوں پہ رکتی ، دلوں میں سام نہیں سکتی ، ۱۲۱
 اتنے خواب کہاں دکھوں گا

یہ گرد بارِ تمنا میں گھومتے ہوئے دن ، ۱۲۳
 جو رستہ بھی دل نے چنا ہے ، ۱۲۵
 نہ ربط ہے نہ معانی ، کہیں تو کس سے کہیں ، ۱۲۷
 دُنیا کا کچھ بُرا بھی تماشا نہیں رہا ، ۱۲۹
 کچھ اس طرح دیکھا کسی بے وفائی ، ۱۳۱
 جو کچھ دیکھا جو سوچا ہے وہی تحریر کر جائیں ، ۱۳۳
 تھکی تھکی سی تنہائی ہے گھٹی گھٹی بیزار ہے ، ۱۳۵
 کوئی خوابِ دشتِ فراق میں برشام چہرہ کشا ہوا ، ۱۳۷
 پہلو سے اٹھ کے آپ کچھ ایسی اداسے گل گئے ، ۱۳۹
 جاہ کی خواہش بے فیض پر مرنے والے ، ۱۴۱
 بارغ جہاں سے صورتِ شبنم چلے گئے ، ۱۴۳
 دل ترے غم کی بارگاہ میں ہے ، ۱۴۵
 ہے محبت کا سلسلہ کچھ اور ، ۱۴۹
 اک نام کی اڑتی خوشبو میں اک خوابِ سفر میں رہتا ہے ، ۱۵۲
 محبت کا ثمر ملتا نہیں ہے ، ۱۵۴
 اک مرابِ سیمیا میں رہ گئے ، ۱۵۷
 دُشک کسی کی ہے کہ گمان دیکھنے تو دے ، ۱۵۹
 عشق ایسا عجیب دریا ہے ، ۱۶۱
 جو زخم توڑنے دیے تھے وہ بھرتے جاتے ہیں ، ۱۶۳
 سب ہیں پکنے والے ہاتھ ، ۱۶۵

گردے کل سا لگتا ہو جو آنے والا کل ، ۵۹
 خود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دن ، ۶۱
 خواہش کی کسی موج کے ریٹے میں رہیں گے ، ۶۴
 دردِ دل کا جہاں رواج نہیں ، ۶۶
 رات کی سیجِ خالی خالی ہے ، ۶۹
 افلاک کا سایہ ہے جو کچھ بھی زمین پر ہے ، ۷۱
 کرتا ہوں جمع میں تو بکھرتی ہے ذات اور ، ۷۲
 شمارِ گردِ شیل و نہار کرتے ہوئے ، ۷۵
 دو گھڑی دل کا حال سُنتا جا ، ۷۸
 آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے ، ۸۰
 جو بھی اُس چشمِ خوش نگاہ میں ہے ، ۸۲
 دل کو حصارِ رنجِ دالم سے نکال بھی ، ۸۵
 بادشہ کی آواز

جو دیکھنے کا تمہیں اہتمام کرتے ہیں ، ۸۸
 حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے ، ۹۱
 اے گردِ شمسِ حیات کبھی تو دکھا وہ نیند ، ۹۳
 اپنی نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا ، ۹۵
 عمر اک خوابِ سجانے میں گئی ، ۹۸
 کسی کی دُھن میں ، کسی کے گماں میں رہتے ہیں ، ۱۰۰
 ہمارے سارے خواب ، جاں ! ، ۱۰۳
 یوں تو کیا چیز زندگی میں نہیں ، ۱۰۶
 اب تک نہ کھل سکا کہ مرے رُو بردہ ہے کون ! ، ۱۰۹
 گردِ سفر میں بھول کے منزل کی راہ تک ، ۱۱۲
 دل کے کہنے پہ جب لڑے تم تھے ، ۱۱۵

اُسے پیاد

ہمارے بعد ہیں کچھ بوگ کیسے، دیکھ تو ائیں ، ۱۶۹

۱۷۱

یہ کون آج مری آنکھ کے حصار میں ہے ، ۱۷۳

کوئی موسم ہو دل میں ہے تھاری باد کا موسم ، ۱۷۵

کہیں سنگ میں بھی ہے روشنی کہیں آگ میں بھی دھواں نہیں ، ۱۷۷

لبوں پہ پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے ، ۱۷۹

غزاں کی دُھند میں پٹے ہوئے ہیں ، ۱۸۱

اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں ، ۱۸۳

وہ دکتی ہوئی لوگمانی ہوئی وہ چمک دار شعلہ، فسانہ ہوا ، ۱۸۶

کسی کی دُھن میں جینا ہے، کسی کے ڈر میں رہنا ہے ، ۱۸۸

ایک احساس دل کشا سے ہی ، ۱۹۰

ہم تھے ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا ، ۱۹۳

قاصد جو تھا بہار کا نام مقبر ہوا ، ۱۹۶

ویرانہ وجود میں چلنا پڑا ہمیں ، ۱۹۸

سر طاق جاں نہ چراغ ہے پس بام شب نہ سحر کوئی ، ۲۰۰

شام بچتی، چراغ جلتا رہا ، ۲۰۲

ہر پل دھیان میں بنے والے بوگ افسانے ہو جاتے ہیں ، ۲۰۴

نہیں اب جہاں پہ نشان بھی ، ۲۰۶

۲۰۹

مکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا ، ۲۱۱

مجنور میں کھو گئے ایک ایک کر کے ڈوبنے والے ، ۲۱۳

کوئی سبب تھا نہ وصال تھا مے سامنے ، ۲۱۵

جہاں کشتی رُکی میری کنار اور تھا کوئی ، ۲۱۷

حد سے حد، حد گناہ تک کوئی جاسکتا ہے ، ۲۱۹

زیر لب یہ جو تبسم کا دیار رکھا ہے ، ۲۲۱

ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے ، ۲۲۳

ذرا پھر سے کہنا

تو نہیں تیرا استعارہ نہیں ، ۲۲۵

مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے ، ۲۲۷

دُور تلک ویرانہ ہے ، ۲۲۹

مقتل میں بھی اہل جنوں ہیں کیسے عزل خواں دیکھو تو ! ۲۳۱

کس رات کی آنکھوں میں پیمانِ سحر ہوگا ، ۲۳۳

کون سی چیز دل کے بس میں نہیں ، ۲۳۵

پیڑ کو دیمک لگ جلنے یا آدم زاد کو غم ، ۲۳۷

ٹلے کیسے صدیوں کی پیاس اور پانی ، ۲۳۹

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ ادھر سے ، ۲۴۱

دریا کی ہوا تیر تھی کشتی تھی پرانی ، ۲۴۳

تری زد سے نکلنا چاہتا ہے ، ۲۴۵

چھپڑیں گے وہی قصہ غم اور طرح سے ، ۲۴۷

۲۴۹

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے ، ۲۵۱

کہاں آکے رکنے تھے راتے کہاں موڑ تھا اُسے مھول جا ، ۲۵۳

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا ، ۲۵۶

یا نجد ارادہ اور کوئی ! ، ۲۵۹

شہد کہیں گے سم کو بھی ، ۲۶۱

وہ جو اوپر ہے بیٹھا ہوا ، اور ہے ، ۲۶۳

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں فرصت کتنی ہے ، ۲۶۵

جو سردار آ نہیں سکتا ، ۳۱۱
 اُس نے آہستہ سے جب پیکارا مجھے ، ۳۱۳
 لوہیں رنگ لہرانے لگے ہیں ، ۳۱۵
 اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا ، ۳۱۸
 جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے ، ۳۲۱
 کبھی تو دل توتاؤں کے اس گرداب سے نکلے ، ۳۲۳
 کبھی رقصِ شام بہا میں اُسے دیکھتے ، ۳۲۵
 کسی کی آنکھ میں خود کو تلاش کرنا ہے ، ۳۲۷
 زندگانی ، جاودانی بھی نہیں ، ۳۲۹
 زندگی درد بھی ، دوا بھی تھی ، ۳۳۱
 آنکھوں سے اک خواب گزرنے والا ہے ، ۳۳۳

ساقواں در

وہ بادِ شام تھا اُس کو گزر ہی جانا تھا ، ۳۳۵
 ہجومِ صید میں دیکھا گھرا ہوا صیاد ، ۳۳۷
 کتنے کو میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں ، ۳۳۹
 نعرہ نہیں تو نالہ ہی کوئی بلند ہو ، ۳۴۱
 کسی کی آنکھ جو پر غم نہیں ہے ، ۳۴۳
 تلاشِ منزلِ جاناں تو اک بہانہ تھا ، ۳۴۵
 بستنیوں میں اک صدائے بے صدارہ جاتے گی ، ۳۴۷
 تم سے بچھڑ کر پہروں سوچتا رہتا ہوں ، ۳۴۹
 دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے ، ۳۵۱
 دل میں لاوا اُبل رہا ہے کیا ؟ ، ۳۵۳
 اب کے سفر ہی اور تھا ، اور ہی کچھ سراب تھے ، ۳۵۵
 شبِ فراق کی خوشبو غروبِ شام میں تھی ، ۳۵۸

شمعِ غزل کی نو بون جانے ایسا مصرعہ ہو تو کہو ، ۲۶۷
 حضورِ یار میں حرفِ التجا کے رکھے تھے ، ۲۶۹
 آگ لگی تھی سینہ سینہ ہر شعلہ جو آلا تھا ، ۲۷۱
 بہنا بھیڑ میں اک اجنبی کا سامنا اچھا لگا ، ۲۷۳
 ایک آزار ہوئی جاتی ہے شہرت ہم کو ، ۲۷۵
 شہرِ اجڑا ہو تو آباد کروں ، ۲۷۷
 جو اتر کے زینہ شام سے تری چشمِ خوش میں سما گئے ، ۲۷۹
 شکستہ لاکھ ہو تیا کسی کی ، ۲۸۱

فشار

غبارِ دشتِ طلب میں ہیں رنگاں کیا کیا ، ۲۸۳
 پیسا ہوئی سپاہ تو پرچم بھی ہم ہی تھے ، ۲۸۶
 کب سے ہم لوگ اس بھنور میں ہیں ، ۲۸۸
 جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا ، ۲۹۰
 سائے ڈھلنے ، چراغِ جلنے لگے ، ۲۹۳
 پردے میں اُس بدن کے چھپیں راز کس طرح ، ۲۹۵
 اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہوئے ، ۲۹۷
 لہو کے پھول سرِ شاخِ انتظار رکھلے ، ۲۹۹
 لوہیں تیرے پھرتے ملال سے کچھ ہیں ، ۳۰۱
 پلکوں کی دہلیز یہ چمکا ایک تارا تھا ، ۳۰۳
 تارا تارا اتر رہی ہے راتِ سمندر میں ، ۳۰۵
 لرزشِ نگر میں ، لہجہ میں کنکت عجیب تھی ، ۳۰۷
 دشتِ دل میں سرابِ تازہ ہیں ، ۳۰۹

خواب نگر ہے آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں ، ۲۰۲
 دیکھتا رہتا ہوں میں جو کچھ پریشانی کرے ، ۲۰۳
 ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی ، ۲۰۵
 کون سی منزل پہ لے آئی اکائی ذات کی ، ۲۰۷
 دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے ، ۲۰۸
 رات میں اس کش مکش میں ایک پل سویا نہیں ، ۲۱۰
 بند تھا دروازہ بھی اور گھر میں بھی تنہا تھا میں ، ۲۱۱
 سکونِ محال ہے امجد و ناکے رستے میں ، ۲۱۲
 میں ازل کی شان سے ٹوٹا ہوا ، ۲۱۳

کس قدر زخم زخم چہرا ہے ، ۳۶۰
 گزر گیا جو زمانہ اُسے بھلا ہی دو ، ۳۶۳
 رواں دواں ہے سفرِ پیش و پس نہیں معلوم ، ۳۶۵
 وہی ہے درد کا عالم اُسے بھلا کر بھی ، ۳۶۷
 رُتوں کے ساتھ دلوں کی وہ حالتیں بھی گئیں ، ۳۶۹
 چپکے چپکے ہی اثر کرتا ہے ، ۳۷۱
 نہ آسمان سے نہ دشمن کے زور و زور سے ہوا ، ۳۷۳
 جو دوست ہی نہ رہا، اس سے اب لگہ کیا ہے ! ، ۳۷۵
 سانسوں میں اشتعال سا ہوا تو ہے ، ۳۷۷
 نکل کے حلقہ شام و سحر سے جا میں کہیں ، ۳۷۹
 بامِ و در سے ہی بات کی جائے ، ۳۸۱
 آنکھوں میں بازوید کا ارمان رہ گیا ، ۳۸۲
 میں بے نوا ہوں صاحبِ عزت بنا مجھے ، ۳۸۶
 ہر شخص کی خون رنگ تباہی کہ نہیں ہے ؟ ، ۳۸۷
 یہ دشتِ ہجر، یہ وحشت، یہ شام کے سائے ! ، ۳۸۹
 چاند کے ساتھ کئی درد پرانے نکلے ، ۳۹۰
 ترکِ اُلفت کا بہانہ چاہے ، ۳۹۲
 خزاں کے پھول کی صورت بکھر گیا کوئی ، ۳۹۳
 یہی بہت ہے کہ دل اُس کو ڈھونڈ لایا ہے ، ۳۹۵
 پھول کو رنگ ستارے کو ضیا کس نے دی ! ، ۳۹۶
 اوروں کا تھا بیان تو موجِ صدار ہے ، ۳۹۷
 گفتگو میں ایک بیک تبدیلی آواز کیا ! ، ۳۹۹
 عشاق نہ پتھر نہ گدا کوئی نہیں ہے ، ۴۰۰
 ہم ہی آغازِ محبت میں تھے انجان بہت ، ۴۰۱

غزلیں

کہتے ہیں غزلِ قافیہ پیمائی ہے ناصر

یہ قافیہ پیمائی، ذرا کر کے تو دیکھو

اسی بات کو اگلے وقتوں میں قبلہ میر تقی میر نے کچھ یوں بیان کیا تھا کہ

مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں

کس خوش سینگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

اور کم و بیش اسی کیفیت کو غالب نے اپنی فطری جودتِ طبع کے باعث ایک نیازنگ کچھ

اس طرح سے دیا کہ ”خرفِ تنگنائے غزل“، اُس سیل بلا کو سمیٹنے سے عاجز ہے

جو اُس کی فکر اور ذہن میں ہمہ وقت کر وٹیں بینا رہتا ہے سو

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ امر اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ جہاں

غزل کے امکانات اور اس کی سحرِ کاری اور جادو آفرینی کہکشاں در کہکشاں

پھیلتی چلی جا رہی ہے وہاں ہر دور میں غزل کہنے والوں نے ایسے ایسے رنگ اور پیرائے بازھے اور ایجاد کیے ہیں کہ غزل ہر امتحان سے نہ صرف کامیاب نکلی ہے بلکہ اس کے حُسن کی تہی سے تہی جہات بھی سلنے آتی رہتی ہیں۔

غزل کی اس قدر مضبوط کلاسیکی روایت اور موجودہ تخلیقی عمل اور امکانات سے پر صورت حال میں کسی بھی غزل گو شاعر کے لیے ایسا نام حاصل کرنا جو ایک حوالہ بن جائے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ میں اپنے آپ کو اس میدان کی پہلی صف کا آدمی نہیں سمجھتا کہ غزل گو شاعروں کی پہلی صف میں داخل ہونے کے لیے جس غیر معمولی صلاحیت کی ضرورت ہے وہ مجھے اپنی غزل میں نظر نہیں آتی۔ ناصر کاظمی مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب وہ کوئی غزل کہہ لیتے ہیں تو تصور میں میر و غالب کو سامنے بٹھا کر ان کو سناتے ہیں اور پھر ان کے اشارہ چشم و ابرو یا داد کے کلمات کی روشنی میں اُس غزل کا مقام متعین کرتے ہیں۔ جب ناصر جیسے عمدہ اور بالکمال شاعر کا پر حال تھا تو ہم جیسے لوگوں کو تو کوئی دعویٰ کرتے وقت دس بار سوچنا چاہیے (یہ اور بات ہے کہ بہت سے احباب اپنے مقام کے تعین میں خود میر و غالب کو بھی کہیں ملیں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں) جہاں تک میر تعلق ہے۔ میں نے ہمیشہ ہی کوشش کی ہے کہ اردو غزل کے اکابرین کے ساتھ ساتھ اپنے سینئر ہم عصروں اور اپنے سے بعد لکھنا شروع کرنے والوں سے بھی اس شعبہ ساز صفت کے نت نئے اسرار و رموز اور پیرایوں کو سیکھنے کی کوشش کروں تاکہ جو باتیں میں بزبان غزل کہنا اور کرنا چاہتا ہوں

ان کا رشتہ اس کی عظیم اور زندہ روایت سے قائم اور جڑا رہے۔
مجھے خوشی ہے کہ نظموں کے ساتھ ساتھ میری غزلوں کے قارئین کا بھی ایک خاصا بڑا حلقہ قائم ہو گیا ہے۔ میرے لیے اتنی ہی پذیرائی بہت ہے کہ بڑے لوگوں کے گروپ فوٹو میں جگہ مل جانا بھی اپنی جگہ پر ایک عزت اور افتخار کی بات ہوتی ہے۔

محمد اسلام امجد

سخت ارادہ



حد سے توقعات زیادہ کیے ہوئے
بیٹھے ہیں دل میں ایک ارادہ کیے ہوئے

اس دشتِ بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہوئے

دیکھو تو کتنے چین سے! کس درجہ مطمئن!
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہوئے

○
 درو دیوار ہیں، مکان نہیں
 واقعہ ہے، یہ داستان نہیں
 وقت کرتا ہے ہر سوال کو حل
 زینت مکتب ہے امتحان نہیں
 ہر قدم پر ہے اک نئی منزل
 راستوں کا کہیں نشان نہیں
 رنگ بھی زندگی کے منظر ہیں
 صرف آنسو ہی ترجمان نہیں

ق

پاؤں سے خواب باندھ کے شامِ فصال کے
 اک دشتِ انتظار کو جاہ کیسے ہوئے!
 آنکھوں میں لے کے جلتے ہوئے موسموں کی رکھ!
 گردِ سفر کو تن کا لبادہ کیسے ہوئے
 دیکھو تو کون لوگ ہیں! آئے کہاں سے ہیں!
 اور اب ہیں کس سفر کا ارادہ کیسے ہوئے؟
 اُس سادہ رُو کے بزم میں آتے ہی جُھگئے
 جتنے تھے اہتمام زیادہ کیسے ہوئے
 سہرا اٹھے ہیں اُس کی بزم سے امجد ہزار بار
 ہم ترکِ آرزو کا ارادہ کیسے ہوئے!

کہ یوں جو بیٹھے ہو بے تعلق سے
کیا سمجھتے مری زبان نہیں؟

کوئی دیکھے تو موت سے بہتر
زیست کا کوئی پاسبان نہیں

کہ اک طرف میں ہوں اک طرف تم ہو
سلسلہ کوئی درمیان نہیں

دل سے نکلی ہوئی صدا کے لیے
کچھ بہت دُور آسمان نہیں

کل کو ممکن ہے، اک حقیقت ہو
آج جس بات کا گمان نہیں

شور کرتے ہیں ٹوٹتے رشتے
ہم کو گھر چاہیے مکان نہیں

خواب، ماضی، اسراب، مستقبل!
اور جو ہے "وہ میری جان نہیں"

راتنے تارے تھے رات، لگتا تھا
کوئی میلہ ہے آسمان نہیں

شناخِ سدرہ کو چھو کے لوٹ آیا
اس سے آگے مری اڑان نہیں

چلو کہ کوچہ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخل دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا!

خدا کے خوف سے جو دل لڑتے رہتے ہیں
انہیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

کہہ کر کو جاتے ہیں رستے، یہ راز کیسے کھلے
جہاں میں کوئی بھی بارِ دگر نہیں آیا

یہ کیسی بات کہی شام کے ستارے نے
کہ چینِ دل کو ہرے رات بھر نہیں آیا

ہمیں یقین ہے اجد نہیں وہ وعدہ خلاف
پہ عمر کیسے کٹے گی، اگر نہیں آیا!

Amir

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

وفا کے دشت میں رستہ نہیں ملا کوئی
سوائے گردِ سفر، ہم سفر نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا

کسی چراغ نے پوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھول ہرے نام پر نہیں آیا

ہم تو ایسے خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر جو بھی تھی

ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
ہل چل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

جو سامنے ہے، سب سے پہلے، اپنے کیے کا پھل
تقدیر کی تو چھوڑیئے، تقدیر جو بھی تھی

آیا اور اک نگاہ میں برباد کر گیا
ہم اہل انتظار کی جاگیر جو بھی تھی

قدریں جو اپنا مان تھیں، نبیلام ہو گئیں
بلبے کے مول پاک گئی تعبیر جو بھی تھی

طالب ہیں تیرے رحم کے ہم عدل کے نہیں
جیسا بھی اپنا حُب م تھا، تقصیر جو بھی تھی

ہاتھوں پہ کوئی زخم نہ پیروں پہ کچھ نشان
سوچوں میں تھی پڑی ہوئی، زنجیر جو بھی تھی

یہ اور بات چشم نہ ہو معنی آشنا
عبرت کا ایک درس تھی تحریر جو بھی تھی

امجد ہماری بات وہ سننا تو ایک بار
آنکھوں سے اُس کو چومتے، تعزیر جو بھی تھی

کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دُھند

فردوسِ گوش ٹھہرا ہے مبہم سا کوئی شور
نظارگی کا شہر میں ہے اعتبار، دُھند

ناٹک میں جیسے بکھرے ہوں کردار جا بجا
امجد فضاے جاں میں ہے یوں بے قرار دُھند

منظر کے ارد گرد بھی اور آر پار دُھند
آئی کہاں سے آنکھ میں یہ بے شمار دُھند!

کیسے نہ اُس کا سارا سفر رائیگاں ہے
جس کا روانِ شوق کی ہے رہ گزار دُھند!

ہے یہ جو ماہ و سال کا میسہ لگا ہوا
کرتی ہے اس میں چھپ کے مرا انتظار دُھند

آنکھیں وہ بزم، جس کا نشان ڈولتے چراغ
دل وہ چین، کہ جس کا ہے رنگ بہار دُھند

سہم اپنی عمر کی ڈھلتی ہوئی اک سہ پہر میں ہیں
جو ملنا ہے ہمیں تو بل، چراغِ شام سے پہلے

ہمیں اے دوستو اب کشتیوں میں رات کرنی ہے
کہ چھپ جاتے ہیں سب ساحل، چراغِ شام سے پہلے

سحر کا اولین تارا ہے جیسے رات کا ماضی
ہے دن کا بھی تو مستقبل، چراغِ شام سے پہلے

نجانے زندگی اور رات میں کیسا تعلق ہے!
اُجھتی کیوں ہے اتنی رگ، چراغِ شام سے پہلے

محبت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی!
کہ جل اٹھا ہے اجداد، چراغِ شام سے پہلے



اُداسی میں گھرا تھا دل چراغِ شام سے پہلے
نہیں تھا کچھ سہر محفل چراغِ شام سے پہلے

حُدی خوانو، بڑھاؤئے اندھیرا ہونے والا ہے
پہنچنا ہے سر منزل چراغِ شام سے پہلے

دلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اُٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جھل بل چراغِ شام سے پہلے

وہ ویسے ہی وہاں رکھی ہے، عصرِ آخر شب میں
جو سینے پر دھری تھی بل، چراغِ شام سے پہلے

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا!

اک سرخوشی کی موج نے کیسا کیا کماں!
وہ بے نیاز، سارے کا سارا بدل گیا

اُٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اُٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا، مکان کا نقشہ بدل گیا

شاید وفا کے کھیل سے اکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آ کے جو رستہ بدل گیا

آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا!

کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھریں ہوا کہ خود میرا چہرہ بدل گیا

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اُس نے چھڑایا ہاتھ تو صبح بدل گیا



آنکھوں کو التباس بہت دیکھنے میں تھے
کل شب عجیب عکس مرے آنے میں تھے

سارے دھنک کے رنگ تھے اُس کے لباس میں
خوشبو کے سارے انگ اُسے سوچنے میں تھے

ہر بات جانتے ہوئے دل مانستا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کس مرحلے میں تھے

وصل و فراق دونوں ہیں اک جیسے ناگزیر
کچھ لطف اُس کے قرب میں، کچھ فاصلے میں تھے

قائم کسی بھی حال پہ دُنیا نہیں رہی
تعبیر کھو گئی، کبھی سَپنا بدل گیا

منظر کا رنگ اصل میں سایا تھا رنگ کا
جس نے اُسے جدھر سے بھی دیکھا بدل گیا

اندر کے موسموں کی خبر اُس کو ہو گئی!
اُس نو بہارِ ناز کا چہرہ بدل گیا

آنکھوں میں جتنے اشک تھے جگنو سے بن گئے
وہ مسکرایا اور مری دُنیا بدل گیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
آج یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

جتنے تھے خط تمام کا تھا ایک زاویہ
پھر بھی عجیب بیچ مرے مثلے میں تھے

© امجد کتاب جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح!
لکھنے تھے جتنے لفظ، ابھی حافظے میں تھے

سبیل زماں کی موج کا ہر وار سہ گئے
وہ دن، جو ایک ٹوٹے ہوئے رابطے میں تھے!

غار ت گرمی کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہائے ہوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے!

ہر پھر کے آئے نقطہ آغاز کی طرف
جتنے سفر تھے اپنے کسی دائرے میں تھے

آندھی اڑا کے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشان اسی راستے میں تھے

چھو لیں اُسے کہ دُور سے بس دیکھتے رہیں!
تارے بھی رات میری طرز، منحصرے میں تھے

© جگنو، تارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کسی سلسلے میں تھے!

اُس بے وفا سے ہم کو یہ نسبت بھی کم نہیں
کچھ وقت ہم نے ساتھ گزارا ہوا تو ہے

اپنی طرف اٹھے نہ اٹھے اُس کی چشمِ خوش! (P)
امجد کسی کے درد کا چارا ہوا تو ہے!

ظاہرِ شمال میں کوئی تارا ہوا تو ہے
اذنِ سفر کا ایک اشارا ہوا تو ہے

کیا ہے جو رکھ دیں آخری داؤ میں نقدِ جاں!
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہوا تو ہے

وہ جانے، اُس کو خیرِ خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہوا ہے

پاؤں میں نارسائی کا اک آبلہ سہی
اس دشتِ غم میں کوئی ہمارا ہوا تو ہے

کل ثقب تو اُس کی بزم میں ایسے لگا مجھے!
جیسے کہ کائنات مری دسترس میں تھی

مخض میں آسمان کی بولے کہ چُپ رہے
امجد سدا زمین اسی پیش و پس میں تھی

اُلجھن تمام عمر یہ تارِ نفس میں تھی!
دل کی مُراد عاشقی میں یا ہوس میں تھی!

دُر تھا کھلا، پہ بیٹھے رہے پُرسبیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی نفس میں تھی!

سکتے میں سب چراغ تھے تارے تھے دم بُوڑا!
بیں اُس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی

اَب کے بھی ہے جی ہوئی، آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دُضد جو پچھلے برس میں تھی

تجھ کو چاہوں میں کیا میری اوقات!
 کیسے اُجڑ گئے؟ خوابوں کے باغات
 (ق)

وقت سمندر میں ایک سے ہیں دن رات
 آگے گسری کھائی پیچھے ہے ظلمات!
 غم کے دھاگوں سے امجد خوشیاں کات!

سب کی اک اوقات "عشق نہ پوچھے ذات"
 بالکل بھول گئے کرنی تھی کیا بات
 ستا کر دے گی زر کی یہ افراط!
 (اب سے تیرے ہیں میرے دن اور رات
 سچے جذبوں سے مہنگی ہو گئی دھات
 اب کے خوب ہوئی بن موسم برسات
 کٹ ہی جاتی ہے کیسی بھی ہو رات!
 (ہاسی ہوتی جائے دل میں رکھی بات
 کچھ ڈور، میاں! کب تک دیتی ساتھ!
 (گر ہیں کسولے گا جانے کب وہ ہاتھ!

اگر یہی ہے عدالت! اور آپ ہیں منصف!
 عجب نہیں جو ہمارا بیان ٹوٹتا ہے
 وفا کے شہر کے رستے عجیب ہیں امجد
 ہر ایک موڑ پہ راک مہربان، ٹوٹتا ہے

—



زمین جلتی ہے اور آسمان ٹوٹتا ہے،
 مگر گریز کریں ہم تو مان ٹوٹتا ہے!!
 کوئی بھی کام ہو انجام تک نہیں جاتا!
 کسی کے دھیان میں پل پل یہ دھیان ٹوٹتا ہے
 کہ جیسے متن میں ہر لفظ کی ہے اپنی جگہ
 جو ایک فرد کٹے، کاروان ٹوٹتا ہے
 نژادِ صبح کے لشکر کی آمد آمد ہے
 حصارِ حلقہٴ شبِ زادگان ٹوٹتا ہے

سارے خاکِ سمان
 (اپنوں ہی سے تو) رے اچھا ہے
 رے اچھا ہے
 پیاس بڑی ہے یا
 کیا اُفتاد پڑی!
 آدم زاد نہیں،
 کیسا بھی ہو روپ!
 سکے کے دورِخ
 دھوکہ دیتے ہیں
 راہ میں کھٹنا پھول
 دونوں جھوٹے ہیں
 آہٹ کس کی ہے
 اتنی خواہش کر
 ہم تم دونوں ہیں
 عکس بنے کیسے؟
 تن اور من اور دھن
 ہوتی ہے ان بن
 اپنا گھر آنگن!
 سونے کا برتن؟
 لگتا ناہیں من
 بستی ہے یا بن!
 مٹی ہے مدفن
 برہن اور دلہن
 اُبلے پیراہن
 بیوہ کا جو بن
 ساجن اور ساون
 تیز ہونٹی دھڑکن
 جتنا ہے دامن
 دھرتی اور ساون
 دھندلا ہے درپن

کہتا ہے درپن
 تاریکی کی موت!
 محنت اپنا مال
 بات نہ کرنے سے
 اپنے دل جیسا!
 دُنیا۔ اٹوٹا دے
 جھولے جی اٹھے
 روز وہی قصہ!
 صدیاں ٹوٹ گئی
 یہ تو برسے گا
 میرے جیسا بن!
 ایک نجف کرن
 وقت، پرایا دھن
 بڑھتی ہے اُلجھن
 کوئی نہیں دشمن
 میرا اپنا پن
 جاگ پڑے جامن
 روز وہی اُلجھن!
 پائل کی چھن چھن
 ساون ہے، ساون!
 یہ تو برسے گا

زیرِ آب ہوئے خوابوں کے مسکن
ٹھہر گیا ہے کیوں! آنکھوں میں ساون!

(ق)

کپت سونا ہی بنتا ہے کُن دن
اک دن نکھرے گا سچا ہے گر، فن!
کیسے روک سکے! خوشبو کو گلشن

اجد میرے ساتھ

اب تک ہے بچپن!

✓ کسی تنگ، کسی سرخوشی میں رہتا تھا
یہ گل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جیسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی نو
کھلا کہ میں بھی کسی روشنی میں رہتا تھا

سرشتِ آدمِ خاکی، ذرا نہیں بدلی!
فلک پہ پہنچا مگر، غار ہی میں رہتا تھا

بس ایک شام بڑی خاموشی سے ٹوٹ گیا
ہمیں جو مان، تری دوستی میں رہتا تھا

کھلا جو پھول تو برباد ہو گیا
محبدر
طلسم رنگ مگر غنچگی میں رہتا تھا

کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زمانے میں
ہجوم درد، غم بے کسی میں رہتا تھا

ق

کلام کرتا تھا تو سقزح کے رنگوں میں
وہ اک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

گلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صورت
صدا کی لہر تھا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حُسنِ نظر کی بھی کچھ اُسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

وہاں پہ اب بھی سارے طواف کرتے ہیں
وہ جس مکان میں، جس بھی گلی میں رہتا تھا

تھے مثبت حکم، سب پر پہ اُس کے بھی دستخط
تقدیر ہی کا لکھا ہوا فیصلہ نہ تھا

اک سمت پاسِ عشق تھا، اک سمت اپنا مان
کیسے گریز کرتے! کوئی راستہ نہ تھا!!

انجید یہ اقتدار کا حلقہ عجیب ہے
چاروں طرف تھے عکس کوئی آئینہ نہ تھا

سب دیکھتے تھے اور کوئی سوچتا نہ تھا
جیسے یہ کوئی کھیل تھا، اک واقعہ نہ تھا!

لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تاثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

آپس کی ایک بات تھی دونوں کے درمیاں
اے اہل شہر آپ کا یہ مسئلہ نہ تھا!

تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے!
اس کے سوا ہمارا کوئی مدعا نہ تھا

ق

بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ نہ ملتے جائیں
 ایک چراغ سہی راہ میں دھرتے جائیں
 سچی بات لکھیں جب تک رکھتے جائیں
 جو کچھ بس میں ہے وہ تو کرتے جائیں
 رزم ہستی سے لڑتے لڑتے جائیں
 مردہ مٹی کو زندہ کرتے جائیں
 جب تک زندہ ہیں آگے بڑھتے جائیں

ق

اُدھم اور تم ایسا کرتے جائیں
 آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے جائیں
 باتوں باتوں میں غنچے رکھتے جائیں

○
 جب تک رستے جائیں یوں ہی چلتے جائیں
 آئینوں سے کیوں؟ عکس مکتے جائیں!
 آنکھیں ہیں آباد! خواب اُجڑتے جائیں
 ایسی آندھی میں! خاک سنورتے جائیں!!
 اپنی سوچوں سے آپ ہی ڈرتے جائیں
 عکس کریں تو کیا نقش بگڑتے جائیں
 جلتی آنکھوں میں پسینے بجھتے جائیں
 جتنا دھتکارے اور پلٹتے جائیں
 رویں خود پر ہی کچھ تو کرتے جائیں!

رنگوں میں رنگیں خوشبو ہوتے جائیں
 اُمیدیں پھوٹیں خدشے مرتے جائیں
 اجد سب کے دل
 اور نکھرتے جائیں



گزرے کل سا لگتا ہو جب آنے والا کل
 ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل

کرتی ہیں ہر شام یہ بنتی، آنکھیں بیت بھری
 روشن ہوائے امن کے تارے، ظلم کے سُورج، دھل

اپنا مطلب کھودیتی ہے دل میں رکھی بات (۱۲)
 رونا ہے تو کھل کے رو اور جلنا ہے تو، جل

لمحوں کی پہچان یہی ہے، اُڑتے جاتے ہیں
 آنکھوں کی دہلیز پہ کیسے ٹھہر گیا، وہ پیل!

عشق کے رستے لگ جائیں تو لوگ بھلے چنگے
ہوتے ہوتے ہو جاتے ہیں، دیوانے، پاگل!

موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی!
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل!

جھکی جھکی آنکھوں کے اوپر بوجھل بکپیں تھیں
لیکن کیسے چھپ سکتا تھا! کاجل ہے کاجل!

زور آور کے دستِ ستم میں دونوں گرومی ہیں
مزدوروں کا خونِ پسینہ دہقانوں کا ہل!

بُجھتے تاروں کی جھلمل میں اوس لرزتی ہے
آج دُنیا جاگ رہی ہے تو بھی آنکھیں مل

خود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دن
یوں ہے کہ تجھے بھول کے دیکھیں گے کسی دن

بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دُنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن

ہل جائیں گے اک بار تو عرشوں کے در و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بویں گے کسی دن

خوشبو کی طرح، مثل صبا، خوابِ ناس سے
 گلیوں سے ترے شہر کی گزریں گے، کسی دن
 اجد ہے یہی اب کہ کفنِ باندھ کے سر پر
 اُس شہرِ ستم گار میں جاؤں گے کسی دن!

آپس کی کسی بات کا ملتا ہی نہیں وقت
 ہر بار یہ کہتے ہیں کہ ”بیٹھیں گے کسی دن!“

اے جان تری یاد کے بے نام پرندے
 شاخوں پہ مرے درد کی اُتریں گے کسی دن؛

جاتی ہے کسی جھیل کی گسرائی کہاں تک!
 آنکھوں میں تری ڈوب کے دکھیں گے کسی دن

خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
 اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
 سائے میں تری زلف کے جاگیں گے کسی دن!

صحرائے خرابی کی اسی گردِ سفر سے
 پھولوں سے بھرے راتے نکلیں گے کسی دن

موجود تو ہوں گے مگر احساس کی صورت!
خوشبو کی طرح رنگ کے میلے میں رہیں گے

آنکھوں میں اتر آئے گی اندر کی اُداسی
امجد جو یونہی آپ اکیلے میں رہیں گے!



خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبِ نغم کی طرح، صُبح کے میلے میں رہیں گے!

دیکھے گی زمیں، روزِ نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ، جھیلے میں رہیں گے

مر جائیں گے ہم تم تو، مگر گیت ہمارے
اے دوستِ رواں، وقت کے بیلے میں رہیں گے

تیرے غم کے سوا زمانے میں
کون سے دزد کا علاج نہیں!

جرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

تیری آنکھوں سے دوسری آنکھیں
شاید ہوں گی کبھی، پر آج، نہیں

مملکت حسن سے نہیں کوئی
عشق سا کوئی تخت و تاج نہیں

ق

کون سی آنکھ ہے تھی تجھ سے!
کون سے دل پہ تیرا راج نہیں!

دزدِ دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے، سماج نہیں

اے غم، حیرا، یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں!

وہ ہے ہر جانی، یہ بجا، لیکن
دل بھی تو مستقل مزاج نہیں

اے خُدا، اے مرے ہنر کے خُدا
اور کچھ میری احتیاج نہیں!

بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ، احتیاج نہیں



رات کی سیج خالی خالی ہے
دیکھ، وہ صبح ہونے والی ہے!

میرے دل سے تری نگاہوں تک
درد نے راہ کیا نکالی ہے!

ہے پرے حد آسمان سے کیا؟
سب فضا اپنی دکھی بھالی ہے

کہہ رہی ہے چمک ستاروں کی
درد کی رات ڈھلنے والی ہے!

جو نہ کہنی تھی بات، کہہ آئے
اور جو کہنی تھی وہ چھپالی ہے

اک طرف دل تھا، اک طرف دُینا
ہم نے دونوں سے سُرملائی ہے

آنکھ والوں کے واسطے، منظر
ایک روزن ہے، ایک جالی ہے!

پھر وہی آنسوؤں کی بارش ہے
پھر وہی دل کی خشک سالی ہے!

پھیلتی جا رہی ہے قوسِ قزح
دل پہ کس نے نگاہ ڈالی ہے

دوستوں کا وہ دوست ہے امجد
نام جس کا جمیل عالی ہے

افلاک کا سایا ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میسر، تعبیر کہیں پر ہے

کچھ ایسی نظر ڈالی ہنگام و دواع اُس نے
میں خود تو چلا آیا دل اب بھی وہیں پر ہے

اے فکرِ سماواتی، اے طائرِ لاہوتی!
پر واز سے کیا حاصل! جو کچھ ہے زمیں پر ہے

”موجود“ میں رہنے سے ”آئندہ“ نہیں ملتا
اثبات کا ہر جلوہ موقوف ”نہیں“ پر ہے

اُس لمحے کے جادو سے پھر وقت نہیں نکلا
جو چیز جہاں پر تھی وہ چیز وہیں پر ہے

چاہے تو یونہی رکھے چاہے تو سحر کر دے
اس رات کا مستقبل اُس ماہ جبیں پر ہے

اس عمر کی فرصت میں ہر چیز کا ہونا ہے
جنت بھی یہیں ہوگی! دوزخ جو یہیں پر ہے

✓

کرتا ہوں جمع میں تو پکھرتی ہے ذات اور
باقی ہے کتنی اے مرے مولا، یہ رات اور!

لیتی ہے جلتی شمع بھی بجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور!

سیلاب جیسے لینا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے غم بھی دل سے کوئی واردات اور

یوں تو حضورِ پاکؐ کے لاکھوں ہیں مدح خواں
تائبؑ سی لکھ رہا ہے مگر کون، نعت اور!

منظر، ازل کے حُسن کے امجد ہیں بے شمار
لیکن جو دیکھئے تو ہے بارش کی بات اور



شمارِ گردشِ بیل و نہار کرتے ہوئے
گزر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہوئے

*خدا گواہ، وہ آسودگی نہیں پائی
تمہارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

ازل سے یونہی چلی آرہی ہے یہ دُنیا
اسے نہال اُسے بے قرار کرتے ہوئے

۱۔ حفیظ تائب

تمام اہل سفر ایک سے نہیں ہوتے
کھلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

ق

عجب نہیں کبھی گزرنے تو رے خیال کی رو
مرے گمان کے طائر شکار کرتے ہوئے

کہیں چھپائے مرے سامنے کے سب منظر
مجھے، مجھی پہ کبھی آشکار کرتے ہوئے

کسے خبر ہے کہ اہل چمن پہ کیا گزری!
غزاں کی شام کو صبح بہار کرتے ہوئے

ہوس کی اور لغت ہے وفا کی اور زباں
یہ راز ہم پہ کھلا، انتظار کرتے ہوئے

عجیب شے ہے محبت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہوئے

ق

جو ہو سکے تو کبھی میر جی سے یہ پوچھیں
یہ جان اُن کی غزل پر نثار کرتے ہوئے

یہ کارخانہ اگر سرنا پا تو ہم ہے؟
تو لوگ کیسے چلیں، اعتبار کرتے ہوئے

A ہمارے بس میں کوئی فیصلہ تھا کب اجمدا
جنوں کو چنتے، وفا اختیار کرتے ہوئے!

تجھ سے کرنا نہیں جواب طلب
آفری اک سوال سُنتا جا

گوئج میں ٹوٹتے ستاروں کی
سب عروج و زوال سُنتا جا

تجھ پہ بیٹی ہے جو بھی کہہ اجمد
کچھ مرے حسب حال سُنتا جا

—



دو گھڑی دل کا حال سُنتا جا
اے مرے خوش جمال سُنتا جا

عشق کی خود سپردگی کو دیکھ!
عقل کی قبیل و قال سُنتا جا

یہ اماوس کی آفری شب ہے
داستانِ ملال، سُنتا جا

”من نہ کر دم، شما حذر بکنید“
زندگی کا مال، سُنتا جا

بنتے بنتے ڈھ جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے!

سائے لڑتے لہتے ہیں ٹہروں کی گلیوں میں
لہتے تھے انسان جہاں اب ہشت رہتی ہے

موسم کوئی خوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
ہر پیل دھیان درپے کے میں اک صورت رہتی ہے

چاپ کوئی جو مڑ جاتی ہے دل دروازے سے
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے!

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

پھولوں کی تنہی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوبح سخن پر ایسے آج شہرت رہتی ہے

آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے
جیسے خالی آنکھوں میں بھی وحشت رہتی ہے

ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے

A) کرنی ہے تو کھل کے کرو، انکار و وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

شہر سخن میں ایسا کچھ کر، عزت بن جائے
سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے عزت رہتی ہے

داتاں، شب کے جاگنے کی، رقم
آنکھ کے حلقہ سیاہ میں ہے

حالتِ جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل دزد کی سپاہ میں ہے

نہیں وہ خواہشِ نجات میں بھی
جو کششِ دامنِ گناہ میں ہے!

بے نیازی سہی طبیعت میں
دلبری بھی تو اُس نگاہ میں ہے

رُوح بیدار ہوتی جاتی ہے
دل کسی روشنی کی راہ میں ہے

تیغِ دو دم سے بھی سوا خطِ رہ
حلقہٴ قُربِ بادشاہ میں ہے

جو بھی اُس چشمِ خوش نگاہ میں ہے
حاکمِ وقت کی سپاہ میں ہے

فراقِ سائل کی بے صدا میں کچھ!
یا کمیِ طرفِ بادشاہ میں ہے؟

اُس کو اہلِ ہو س نہ سمجھیں گے!
لطفِ جو فاصلے کی چاہ میں ہے

بہت آساں ہے مدعی ہونا!
جتنی مشکل ہے سب نباہ میں ہے

کیا یقین ہو کسی پہ جب، اجمد
اپنا ہونا بھی اشتباہ میں ہے!



دل کو حصارِ رنج و الم سے نکال بھی
کب سے پکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

آہٹ سی اُس حسین کی ہر سُوتھی، وہ نہ تھا
ہم کو خوشی کے ساتھ رہا اک ملال بھی

سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمالِ شاعری، تیرا جمال بھی

حُسنِ ازل کی جیسے نہیں دوسری مثال
ویسا ہی بے نظیر ہے اُس کا خیال بھی!

تم دیکھتے تو ایک تماشے سے کم نہ تھا
آشفدگانِ دشتِ محبت کا حال بھی!

اُس کی نگاہِ لطف نہیں ہے، تو کچھ نہیں
امجد یہ سب کمال بھی، صاحبِ کمال بھی!

—

مت پوچھ کیسے مرحلے آنکھوں کو پیش تھے
تھا چودھویں کا چاند بھی، وہ خوشِ جمال بھی!

جانے وہ دن تھے کون سے اور کون سا تھا وقت!
گڈ مڈ سے اب تو ہونے لگے ماہ و سال بھی!

اک چشمِ التفات کی پیسہ تلاش میں
ہم بھی اُجھتے جاتے ہیں، لمحوں کا جال بھی!

دنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ و بال بھی!

اک سرسری نگاہ تھی، اک بے نیاز چُپ
میں بھی تھا اُس کے سامنے، میرا سوال بھی!

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کھلے
سب کچھ فنا کا رزق ہے ماضی بھی حال بھی!

کبھی جو بام پہ ٹھہرے تو چاند زک جائے
غزال دیکھ کے اُس کو خرام کرتے ہیں
(ق)

یہ اہل دزد کی بستی ہے نذر گروں کی نہیں
یہاں دلوں کا بہت احترام کرتے ہیں

جہاں پناہوں کی جانب نظر نہیں کرتے
غریب شہر کو جھک کر سلام کرتے ہیں

ہے ان کی چشم توجہ میں روشنی ایسی
کہ جیسے اس میں ستارے قیام کرتے ہیں

یہاں پہ سکتہ اہل ریا نہیں چلتا
کہ اہل دزد نظر سے کلام کرتے ہیں

یہ حق پرست ہیں کیسے عجیب سوداگر
فنا کی آڑ میں کارِ دوام کرتے ہیں

کارِ دوام



جو دیکھنے کا تمہیں اہتمام کرتے ہیں
زمین سے جھک کے ستارے کلام کرتے ہیں

تو آؤ آج سے ہم ایک کام کرتے ہیں
وفا کے نام سبھی صبح و شام کرتے ہیں

یہ راستہ ہے مگر حیرتی پرندوں کا
یہاں سمے کے مسافر قیام کرتے ہیں

وفا کی قبر پہ کب تک اسے جلا رکھیں
سو یہ چراغ ہواؤں کے نام کرتے ہیں

جہاں جہاں پہ گرا ہے لہو شہیدوں کا
وہاں وہاں پہ فرشتے سلام کرتے ہیں

نہ گھر سے ان کو ہے نسبت نہ کوئی نام رکام
دلوں میں بستے، نظر میں مقام کرتے ہیں

رواجِ اہل جہان سے انھیں نہیں مطلب
کہ یہ تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بھی کچھ ہنر والے
جو اک نگاہ میں امجدِ غلام کرتے ہیں

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں کسی کنول میں تم
کہیں جسمال ہمارا کہیں تمہارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارا کہ یہ دوبارا ہے

وہ منکشف مری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارا ہے

A عجب اُصول ہیں اس کا رُبار دُنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اُتارا ہے

کہیں یہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالم موجود، استعارا ہے

A نجانے کب تھا! کہاں تھا! مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے

✓ یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے، ہم تم!
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے!

اے گردشِ حیات کبھی تو دکھا وہ نیند
جس میں شب وصال کا نشہ ہو، لا وہ نیند

ہرنی سی ایک آنکھ کی مستی میں قید تھی
اک عمر جس کی کھوج میں پھرتا رہا، وہ نیند

چھوٹیں گے اب نہ ہونٹ کی ڈالی پہ کیا گلاب!
آئے گی اب لوٹ کے آنکھوں میں کیا، وہ نیند!

کچھ رُست جگے سے جاگتی آنکھوں میں رہ گئے
زنجیرِ انتظار کا تھا سلسلہ، وہ نیند

اہل نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا!
 سایا ہو جن پہ درد کا، اُن کو پتا کیا؟
 ٹھہرا ہے اک نگاہ پہ سارا مقدمہ
 کیسے وکیل! کون سا منصف! گواہ کیا!
 کرنے لگے ہو اٹھوں پہر کیوں خدا کو یاد؟
 اُس بُت سے ہو گئی ہے کوئی رسم و راہ کیا؟
 اے رپ عدل تو مری فردِ عمل کو چھوڑ
 بس یہ بتا کہ اس میں ہے میرا گناہ کیا؟

دیکھا کچھ اس طرح سے کسی خوش نگاہ نے
 رخصت ہوا تو ساتھ ہی لیتا گیا وہ، نیند
 خوشبو کی طرح مجھ پہ جو بکھری تمام شب
 میں اُس کی مُست آنکھ سے چُنتا رہا، وہ نیند
 گھومی ہے رتجگوں کے نگر میں تمام عمر
 ہر رہ گزارِ درد سے ہے آشنا، وہ نیند
 تو جس کے بعد حشر کا میلہ سجائے گا!
 میں جس کے انتظار میں ہوں اے خدا، وہ نیند!
 مجھ ہماری آنکھ میں لوٹی نہ پھر کبھی
 اُس بے وفا کے ساتھ گئی بے وفا، وہ نیند

رستے میں تھیں غنیم کے پھولوں کی پتیاں
سالار پک گئے تھے تو کرتی سپاہ کیا!

دل میں کوئی اُمید نہ آنکھوں میں روشنی
نکلے گی اس طرح کوئی جینے کی راہ کیا؟

امجد نزولِ شعر کے کیسے بنیں اصول!
سیلاب کے لیے کوئی ہوتی ہے راہ کیا؟

سارے فراقِ سال دُھواں بن کے اڑ گئے
ڈالی ہمارے حال پہ اُس نے نگاہ کیا!

کیا دل کے بعد آبروئے دل بھی رول دیں
دکھلائیں اُس کو جا کے یہ حالِ تباہ کیا؟

جو چٹنا کم بساط ہے، اتنا ہے معتبر
یا رویہ اہلِ فخر کی ہے بارگاہ، کیا!

کیسے کہیں کہ کر گئی اک ثنائیہ کے بیچ
جادو بھری وہ آنکھ، وہ جھبکتی نگاہ کیا!

(ق)

وہ بر بنائے جب رہو یا اتفضائے صبر
ہر بُلو لہوس سے کرتے رہو گے نباہ کیا؟
ہر شے کی مثل ہوگی کوئی بے کسی کی حد!
اس شہر بے ہنر کا ہے دن بھی سیاہ کیا؟

تم بھی چاہو تو نہیں بن سکتی

بات، جو بات بنانے میں گئی

رہ گئی کچھ تو ترے سننے میں

اور کچھ اپنے سنانے میں گئی

عمر بھر کی تھی کمائی میری

جو ترے بام پہ آنے میں گئی

عکس در عکس فقط حیرت تھی

عقل جب آئینہ خانے میں گئی

عمر اک خواب سجانے میں گئی

تیسری تصویر بنانے میں گئی

کٹ گئی کچھ تو غم جہاں میں

اور کچھ ملنے ملانے میں گئی

ایک شعلہ سا کبھی پکا تھا

زندگی آگ بجھانے میں گئی

ایسے سو دے میں تو گھٹا ہے، اگر

آبرو، سر کے بچانے میں گئی!

ہر اک بھنور سے زیادہ تباہ کار ہیں یہ
 جو چند خوف پھٹے بادباہ میں رہتے ہیں
 انہی کے دم سے ہے جاری یہ روشنی کا سفر
 جو دل چراغ کی صورت جہاں میں رہتے ہیں
 یہ اہل درد ہیں ان کا چلن ہے سب سے الگ
 مکان رکھتے ہیں اور لامکاں میں رہتے ہیں
 یہ جان کر بھی کہ انتم ہے مجھ پر بھری مٹی
 یہ لوگ خواہش نام و نشان میں رہتے ہیں!
 کسی سراب کی صورت، کسی گمراہ کی طرح
 ہم اپنے ہست کی ریگِ رواں میں رہتے ہیں
 سسے کا چاک ہے اور خاک ہے حوادث کی
 زمین زاد، سدا امتحاں میں رہتے ہیں



کسی کی دُھن میں، کسی کے گمراہ میں رہتے ہیں
 ہم ایک خواب کی صورت جہاں میں رہتے ہیں
 ہمارے اشک چمکتے ہیں اُس کی آنکھوں میں
 زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں
 جو لوگ کرتے ہیں دُنیا سے سُود کی خواہش
 ہمیشہ گردشِ دورِ زیاں میں رہتے ہیں
 نظر کے سامنے، آپ رواں کے ہوتے ہوئے
 جو اہل صبر ہیں، تشنہ لبیاں میں رہتے ہیں

یہ معجزہ جو نہیں ہے تو اور کیا ہے، حباں!
کہ آگ آگ ہیں اور خاکداں میں رہتے ہیں

ہمارے بختِ ستم ساز کا کمال ہے یہ
گلُ بہار ہیں لیکن خزاں میں رہتے ہیں

حصارِ دشت میں متروک راستوں کی طرح
ہمارے گیت، ترے گلستاں میں رہتے ہیں

مکاں کی قیاس سے، حدِ زمان سے باہر
ہم اپنے ذہن کی موجِ رواں میں رہتے ہیں

سلا غموں کی دُھوپ سے ڈرتے نہیں ہیں وہ امجد
کسی نگاہ کے جو سائبان میں رہتے ہیں

○
ہمارے سارے خواب، جاں!
تری ہی سمت ہیں رواں

یہی اُدھورے راستے
ہیں منزلوں کے تر جہاں

بچھی ہوئی زمین پر
بُھکے ہیں سات آسماں

بنیں گی ابر ایک دن
یہ چھوٹی چھوٹی بدلیاں

زمین کھا گئی انھیں
جو بن رہے تھے آسماں

جو زندگی کا حُسن تھے
وہ لوگ رہ گئے کہاں

بہت تلاش ہو چکی
بس اب تو تھک گئے میاں

کہاں ہیں میرے ہم نفس
کہاں ہیں میرے ہم زباں!

ہے لفظ لفظ روشنی
صدائقوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے

وہی ہیں شہر کی زباں

جو خود زمیں کا بوجھ ہیں

بنے ہیں میسر کارواں

جو روشنی کے چور تھے

وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سداٹھائیں گے

کہاں تھا تخت کو گماں!

یوں تو کیا چیس زندگی میں نہیں
جیسے سوچی تھی اپنے جی میں، نہیں

دل ہمارا ہے چاند کا وہ رُخ
جو ترے رُخ کی روشنی میں، نہیں

سب زمانوں کا حال ہے اس میں
اک وہی شام، جنتری میں نہیں!

ہیں حلاؤں میں کتنی دُنیاؤں
جو کسی حد آگہی میں نہیں!

ہو کلیسا، حرم کہ بُست خانہ
فرق ان میں ہے، بندگی میں نہیں

ایک انساں ہے، زندگی جیسا
اور وہ میری زندگی میں نہیں!

تُو نہیں، تیرا غم ہے چاروں طرف
جس طرح چاند، چاندنی میں نہیں

اجر تو صبر کے حبو میں ہے
موجِ دریا میں، تشنگی میں نہیں

ایک بے نام سے خلا کے سوا
کون سا رنگ، کافر میں نہیں!



اب تک نہ کھل سکا کہ مرے روبرو ہے کون!
 کس سے مکالمہ ہے! پس گفتگو ہے کون!
 سایا اگر ہے وہ تو ہے اُس کا بدن کہاں؟
 مرکز اگر ہوں میں تو مرے چار سُو ہے کون!
 ہر شے کی ماہیت پہ جو کرتا ہے تو سوال
 تجھ سے اگر یہ پوچھ لے کوئی کہ تو ہے کون!
 اشکوں میں چھلکتا ہوا کس کا عکس ہے!
 تاروں کی رگزار ہیں یہ ماہ رُو ہے کون!

ایک گردِ اپ بے خودی کے سوا
 کیا تماشا ہے جو خودی میں نہیں!

ہے ہمارا وہ مدعا امجد
 کوئی بھی جس کی پیروی میں نہیں

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے؛
کس کو پکارتا ہوا یہ کو بہ کو ہے کون!

آنکھوں میں رات آگئی لیکن نہیں کھلا
میں کس کا مدعا ہوں؟ مری جستجو ہے کون!

کس کی نگاہِ لطف نے موسم بدل دیئے
فصل خزاں کی راہ میں یہ مشکبو ہے کون!

بادل کی اوٹ سے کبھی تاروں کی آڑ سے
چھپ چھپ کے دیکھتا ہوا یہ جیلہ جو ہے کون!

تارے ہیں آسمان میں جیسے زمیں پہ لوگ
ہر چند ایک سے ہیں مگر ہو ہو ہے کون!

ہونا تو چاہیے کہ یہ میرا ہی عکس ہو!
لیکن یہ آئینے میں مرے رو برو ہے کون!

اس بے کنار پھیلی ہوئی کائنات میں
بس کو خبر کہ کون ہوں میں! اور تو ہے کون!

سارا فساد بڑھتی ہوئی خواہشوں کا ہے
دل سے بڑا جہان میں امجدِ عدو ہے کون!

اک دوسرے پہ جان کا دینا تھا جس میں کھیل
اب رہ گیا ہے صرف وہ رشتہ نباہ تک

اہل نظر ہی جانے ہیں کیسے اُفق مثال!
حدِ ثواب جاتی ہے حدِ گناہ تک

زنجیرِ عدل اب نہیں کھینچے گا کوئی ہاتھ
رُٹنے ہیں اب تو پاؤں میں تاج و کلاہ تک

پُھولوں سے اک بھری ہوئی بستی یہاں تھی
اب دل پہ اس کا ہونا نہیں اشتباہ تک

آتی ہے جب بہار تو آتی ہے ایک ساتھ
باغوں سے لے کے دشت میں اُگتی گیاہ تک

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاہل سے اک بھری ہوئی چشمِ سیاہ تک

گردِ سفر میں مجھوں کے منزل کی راہ تک
پھر آگئے ہیں لوگ نئی قتل گاہ تک

اک بے کسی کا جال ہے پھیلا چہار سہ
اک بے بسی کی دُھند ہے دل سے نگاہ تک

بالائے سطحِ آب تھے جتنے تھے بے خبہ
اُبھرے نہیں ہیں وہ کہ جو پہنچے ہیں تھاہ تک

جذبات بچھ گئے ہوں تو کیسے جلے یہ دل
 میر سپہ کا نام ہے اُس کی سپاہ تک
 اللہ اعجاب اس زمین پہ آنے کو ہے وہ دن
 عالم کے ہاتھ پہنچیں گے عالم پناہ تک



دل کے کہنے پہ جب لڑے تم تھے
 پھر زمانے سے کیوں ڈرے تم تھے
 نقش تھے ہاتھ کی لکیروں میں
 دسترس سے لگہ پرے تم تھے
 لاکھ پھیلا، سمٹ نہ پائے تم
 دل کی اوقات سے بڑے تم تھے
 تم نے جس رہ کا انتخاب کیا
 اُس کے ہر موڑ پر کھڑے تم تھے

اک شرارِ گمان کی مانند !
دھیان کی راکھ میں پڑے تم تھے

(ق)

جانے کس لہر میں تھا میں شرار!
جانے کس موج میں ہرے تم تھے!

ہاتھ کے لمس سے چھلک اُٹھے
جامِ مے کی طرح بھرے تم تھے

کیا تھا! جس میں اُلجھ گیا تھا میں
جانے کس بات پر اڑے تم تھے؟

ایک ہی لمحہ خموشی میں
حدِ آواز سے پرے تم تھے

یہ بولتے ہوئے لمحے یہ ڈولتی ہوئی شام
ترے جمال کے صدقے، ترے فصاں کے نام

خدا کرے سدا رکھتے رہیں۔ چلیں یوں ہی
ترے لبوں کے ستارے تری نظر کے جام

ترے بدن کی پھیلی میں رک گئی خوشبو
ترے لباس پہ آکر ہوئے ہیں رنگ تمام

طلسم بند قبا سے ہیں انگلیاں روشن
لہو میں آگ کی صورت اتر رہی ہے شام

مہک و فاکا سا ساتھ ساتھ چلتی رہے
مجتہدوں کے سفر کا بخیر ہوا انجام

متاعِ دزد تو ورثہ ہے آنکھ والوں کا
تجھے یہ زخم مبارک ہوا سے دلِ ناکام!

ابھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اس آس پہ کہ تری آنکھ میں کہیں آرام

میں اُس گلی سے گزرتا ہوں بار بار امجد
کبھی تو بام پہ آئے گا میرا ماہِ تمام

کلام کرتی نہیں بولتی بھی جاتی ہے
تری نظر کو یہ کیسی زبان آتی ہے!

کبھی کبھی مجھے پہچانتی نہیں وہ آنکھ
کبھی چراغ سے چاروں طرف جلاتی ہے

عجب تضاد میں پلتی ہے تیرے وصل کی آس
کہ ایک آگ بجھاتی ہے، اک لگاتی ہے

وہ دیکھتی ہے مجھے ایسی مست نظروں سے
مرے لہو میں کوئی آگ نہ سہراتی ہے

یہ چار سُو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اس طرح تری آواز بگمگاتی ہے

یہ کوئی اور نہیں آگ ہے یہ اندر کی
بدن کی رات میں جو روشنی پچھاتی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تری گلیوں سے ہو کے آتی ہے

یہ روشنی بھی عطا ہے تری مجت کی
جو میری رُوح کے منظر مجھے دکھاتی ہے

امید وصل بھی امجد ہے کانسج کی چوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے

لبوں پہ رکتی، دلوں میں سما نہیں سکتی
وہ ایک بات جو لفظوں میں آ نہیں سکتی

جو دل میں ہو نہ زردِ غم تو اشک پانی ہے
کہ آگ خاک کو کندن بنا نہیں سکتی!

یستیں گمان سے باہر تو ہو نہیں سکتا
نظر خیمال سے آگے تو جا نہیں سکتی!

دلوں کی رمز فقط اہل درد جانتے ہیں
تری سمجھ میں مری بات آ نہیں سکتی

یہ سوزِ عشق تو گونگے کا خواب ہے جیسے
مہری زباں، مہری حالت بنا نہیں سکتی

(ق)

سمٹ رہی ہے مرے بازوؤں کے حلقے میں
جیا کے بوجھ سے پلکیں اٹھا نہیں سکتی

جو کہہ رہا ہے سلگتا ہوا بدن اُس کا
بتا بھی پاتی نہیں اور چھپ نہیں سکتی

اک ایسے سجر کی آتش ہے میرے دل میں جسے
کسی وصال کی بارش بچھا نہیں سکتی

تو جو بھی ہونا ہے امجد ہیں پہ ہونا ہے
ز میں مدار سے باہر توجہ نہیں سکتی!

یہ گردِ بادِ تمنا میں گھومتے ہوئے دن
کہاں پہ جا کے رکیں گے یہ بھاگتے ہوئے دن!

غروب ہوتے گئے رات کے اندھیروں میں
نویدِ امن کے سورج کو ڈھونڈتے ہوئے دن

نجانے کون خلا کے یہ استعارے ہیں!
تھارے سجر کی گلیوں میں گونجتے ہوئے دن

نہ آپ چلتے، نہ دیتے ہیں راستہ ہم کو
تھکی تھکی سی یہ شاہیں، یہ اُونگتے ہوئے دن

پھر آج کیسے کٹے گی پہاڑ جیسی رات!
گزر گیا ہے یہی بات سوچتے ہوئے دن

تمام عمر مرے ساتھ ساتھ چلتے رہے
تجھے تلاشتے، تجھ کو پکارتے ہوئے دن

ہر ایک رات جو تعمیر پھر سے ہوتی ہے
کٹے گا پھر وہی دیوار چاٹتے ہوئے دن

میرے قریب سے گزرے ہیں بارہا امجد
کسی کے وصل کے وعدے کو دیکھتے ہوئے دن

جو رستہ بھی دل نے چنا ہے
تیرے غم کی سمت کھلا ہے

پانی پر جو حرف لکھا تھا
دیکھو، کیسے ٹھہر گیا ہے

طہلتی شام کے سائے سائے
تو ہے، تیرا غم ہے کیا ہے!

آگ بجھے تو مدت گزری
آنکھوں میں کیا پھیل رہا ہے؟

ایک سوال ملا تھا، مجھ کو
میں نے تجھ کو مانگ لیا ہے

یوں لگتا ہے جیسے کوئی
مجھ کو مسائل دیکھ رہا ہے

شام کی انگلی تھام کے سُورج
مجھ کو پیا سا لوٹ رہا ہے

طشتِ فناک میں تارے بھر کر
چاند کے ملنے جاتا ہے!

بارش کی آواز سے امجد
شہر کا چہرہ کھل اٹھا ہے

○
رابطہ ہے نہ معافی، کہیں تو کس سے کہیں!
ہم اپنے غم کی کہانی، کہیں تو کس سے کہیں!

ہلیں ہیں برف کی سینوں میں اب دلوں کی جگہ
یہ سوزِ دردِ نہانی، کہیں تو کس سے کہیں؟

نہیں ہے اہل جہاں کو خود اپنے غم سے فراغ
ہم اپنے دل کی گرانی، کہیں تو کس سے کہیں!

پلٹ رہے ہیں پرندے، ہمارے پہلے
عجیب ہے یہ نشانی، کہیں تو کس سے کہیں!

نئے سخن کی طلب گار ہے، نئی دُنیا
وہ ایک بات پرانی، کہیں تو کس سے کہیں

نہ کوئی سُنتا ہے اِجہد نہ مانتا ہے اسے
حدیثِ شامِ جوانی، کہیں تو کس سے کہیں!



دُنیا کا کچھ بُرا بھی تماشا نہیں رہا
دل چاہتا تھا جس طرح ویسا نہیں رہا

تُم سے ملے بھی ہم تو جدائی کے موڑ پر
کشتی ہوئی نصیرب تو دریا نہیں رہا

کہتے تھے ایک پل نہ جنیں گے ترے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وہ وعدہ نہیں رہا

رکاوٹے ہیں اس طرح سے تیرے بعد وزو ثوب
میں سانس لے رہا تھا پہ زندہ نہیں رہا

آنکھیں بھی دیکھ دیکھ کے خواب گئی ہیں تنگ
دل میں بھی اب وہ شوق، وہ لہکا نہیں رہا

کیسے ملائیں آنکھ، کسی آنے سے ہم
امجد ہمارے پاس تو چہرہ نہیں رہا



کچھ اس طرح دیکھا کسی بے وفائی
غضب ہو گئے چنر آنسو چھپانے

علی العنیم دنیا پھر اس بار بھی ہم
ڈٹے ہیں ترے سامنے اے زمانے!

وہی خونِ آدم کی بے چارگی ہے
وہی ہیں جبینیں، وہی آستانے!

معتد رنہ بدلا تو مجبور ہو کر
خدا کتنے بدلے ہیں خلاقِ خدا نے!

۱۲) کسی بے وفائے کو نہ قیمت دکھائے

ہمیں جو دکھایا ہماری وفائے

کچھ اس طرح رہتے ہیں ہم پاس اس کے

کہ جیسے گھروں میں کھلونے پرانے

۷

جو کچھ دیکھا جو سوچا ہے وہی تحریر کر جائیں!
جو کاغذ اپنے حصے کا ہے وہ کاغذ تو بھر جائیں!

نشے میں نیند کے تارے بھی اک ڈوبے پہ گرتے ہیں
تھکن رستوں کی کہتی ہے چلو اب اپنے گھر جائیں

کچھ ایسی بے حسی کی دھند سی پھیلی ہے آنکھوں میں
ہماری صورتیں دیکھیں تو آئینے بھی ڈر جائیں

نہ ہمت ہے غنیمتِ وقت سے آنکھیں ملانے کی
نہ دل میں نحوصلہ اتنا کہ مٹی میں اتر جائیں

گُل اُمید کی صورت ترے باخوں میں رہتے یہ
کوئی موسم ہمیں بھی دے کہ اپنی بات کر جائید

دیارِ دشت میں ریگِ رواں جن کو بناتی ہے
بتائے منزل ہستی کہ وہ رستے کدھر جائید

تو کیا اے قاسمِ اشیاء، یہی آنکھوں کی قسمت ہے
اگر خوابوں سے خالی ہوں تو پچھتاؤں سے بھر جائید

جو بخشش میں ملے امجد، تو اس خوشبو سے بہتر ہے
کہ اس بے فیض گلشن سے بندھی مٹھی گزر جائید

ہلکی تھکی سی تنہائی ہے گھٹی گھٹی بیزاری ہے
ہر کیسے گرداب میں ہم نے کشتی خواب اتاری ہے

نفس و قمر کے جادو گھر میں، بھر دو بڑکی حیرت میں
ہوں لگتا ہے جیسے اب تک "کن" کا کلمہ جاری ہے

مالک اور نوحوں کا رزق کیسے ہیں کتنے رنگ اور کتنے نقش
صفحہ جہاں پر تب جا کر یہ اک تصویر اُبھاری ہے

روح کے اندر جتنے دیئے ہیں سب ہی جلاؤ آج کی رات
جاگنے والو آج کی شب کا لمحہ لمحہ بھاری ہے

دشمتِ وفا کے پیرِ عجب ہیں پھل بھی نہیں چھاؤں بھی نہیں
اور سفر میں آنے والا اک اک چشمہ کھاری ہے

کو یہ چیراغِ آزادی کی امجد قائم دائم ہو
میرے بڑوں نے اپنے لہو سے اس کی نذر اتاری ہے



کوئی خوابِ دشمتِ فراق میں سرِ شام چہرہ کشا ہوا
مری چشمہ تر میں رکا نہیں کہ تھارت جگوں کا ڈس ہوا

مرے دل کو رکھتا ہے تھادمان مرے ہونٹ رکھتا ہے گلِ فشاں
وہی ایک لفظ جو آپ نے مرے کان میں ہے کہا ہوا

ہے نگاہ میں مری آج تک وہ نگاہ کوئی جھسکی ہوئی
وہ بوٹھیاں تھاکسی دھیان میں، وہیں آج بھی ہے لگا ہوا

مرے رت جگوں کے فنار میں، مری خواہشوں کے غبار میں
وہی ایک وعدہ گلاب سا سرِ نخل جاں ہے کھلا ہوا

ترجی چشمِ خوش کی پناہ میں کسی خواب زار کی راہ میں
برعے غم کا چاند ٹھہر گیا کہ تھارات بھر کا تھکا ہوا

ہے یہ مختصر، رہِ عشق پر، نہیں آپ ہم رہے ہم سفر
تو ہو کس لیے یہ مباحثہ، کہاں! کون! کیسے! جدا ہوا

کسی دل کُشا سی پکار سے اسی ایک بادِ بہار سے
کہیں برگِ برگِ نموبلی، کہیں زحسمِ زحسم ہرا ہوا

ترے شہرِ عدل سے آج کیا سبھی درد مند چلے گئے
نہیں کاغذی کوئی پیسہ بن، نہیں ہاتھ کوئی اٹھا ہوا

پہلو سے اٹھ کے آپ کچھ ایسی ادا سے کل گئے
بُجھ گیا شعلہ نوا، تاروں کے پھول جل گئے

حشر کے دن چب پڑا، تیرا مرا معاملہ
یعنی ادق مہتم تھے، اچھا ہوا کہ ٹل گئے

زرد پہ کوئی ہدف نہ تھا، تانی ہوئی کہاں نہ تھی
ترکیش جاں کے تیر سب اپنی ہی سمت چل گئے

آئینہ ماہ و سال میں ہم تجھے جوڑتے رہے
آنکھوں میں دُھند بھر گئی، عکس بدل بدل گئے

ہم نے ترے خیال میں ڈھونڈا ترے جسم کو
لفظوں کی دیکھ بھال میں معنی کہیں نکل گئے

جاہ کی خواہش بے فیض پہ مرنے والے
کسی انسان کی عزت نہیں کرنے والے

وہی اب شہر کی نظروں میں ثنا و ٹھہرے
لب دریا جو کھڑے تھے کئی ڈرنے والے

کس قدر خواب ابھی شعر بنانے ہیں، ہمیں
کتنے خاکوں میں ابھی رنگ ہیں بھرنے والے!

وقت پر زور نہیں، عمر چلی جاتی ہے
سینکڑوں کام پڑے ہیں ابھی کرنے والے

بھول ہوگی تو اُسے دل سے کریں گے تسلیم
ہم نہیں دوں کسی اور پہ دھرنے والے

دیکھ لے آنکھ اٹھا کر ہمیں اے سیلِ ہوس
نہیں اس شہر کے سب لوگ بکھرنے والے

پیار بٹنے سے کبھی ختم نہ ہوگا امجد
دل کے دریا تو نہیں ہوتے اترنے والے

باغِ جہاں سے صورتِ شبنم چلے گئے
کیا کیا کلاہ و مسند و چرچم چلے گئے

ہم تک خود اپنی گھوم کے آنے لگی صدا
کیا سب نوائے درد کے محرم چلے گئے؟

اُن کا حساب کون دے اے ربِ نطق و صوت؟
جو حرفِ ناشنیدہ و مبہم چلے گئے

تُم نے نگاہ پھیر کے دیکھا بس ایک پل
اُس ایک پل میں کتنے ہی موسم چلے گئے

عالم وہی ہے آج بھی، لیکن جو دیکھیے!
جتنے تھے لوگ اتنے ہی عالم، چلے گئے

روشن اُسی طرح سے ہے اہل ہنر کی خاک
ساغر کے ساتھ ساتھ کئی حجم، چلے گئے

جاگاہ نہ سخنِ دارِ وفا پر کوئی چپراغ
امجد تو سر کو شمع کیے، ہم، چلے گئے

○
دل ترے غم کی بارگاہ میں ہے
جیسے قیدی حضورِ شاہ میں ہے

شہر والوں کو کچھ خبر ہی نہیں
کیسا سیلاب آج راہ میں ہے

ہے تعلق تو ایک سادہ لفظ
پھیر جو بھئی ہے وہ نباہ میں ہے

سادتہ ہو چکا کہ ہونا ہے!
بھیڑ کیسی یہ شاہراہ میں ہے!

اُس کو رنگِ جہاں سے کیا ڈرنا
جو تری چشم کی پناہ میں ہے

(ق)

وہ سیاہی تو رات میں بھی نہیں
جو مرے نامہٴ سیاہ میں ہے

جیسے دُگانِ شیشہ گر میں بیل
وقت، یوں دل کی کارگاہ میں ہے

گردِ بادِ وقت کی منزل ہی
دامنِ دشتِ بے پناہ میں ہے

نارِ سا بخت کا گلہ کیسا!
جب سفر ہی تمام راہ میں ہے

سر میں بھی ہو یہ لازمی تو نہیں!
جو فصیلت کسی کُلاہ میں ہے!

دیکھنے میں تو ایک ہے دریا
سطح پر وہ نہیں جو تھاہ میں ہے

ہم کسی تیسرے کی منزل ہیں
دل کسی دوسرے کی راہ میں ہے

(ق)

رُوحِ درویش تو ہے لنگر میں
اور بدن اُس کا خانقاہ میں ہے

فیض وہ ہے جو خلق کو پہنچے
کب یہ پتھر کی بارگاہ میں ہے!

درد وہ مضمحل پرندہ ہے
جس کا گھر ہی دل تباہ میں ہے

کب سے میں نے پنک نہیں جھپکی!
کوئی امجد مری نگاہ میں ہے!

ہے محبت کا سلسلہ کچھ اور
درد کچھ اور ہے دوا کچھ اور!

غم کا صحرا عجیب صحرا ہے
جتنا کاٹا یہ بڑھ گیا کچھ اور

کیسی قسمت ہے آنکھ والوں کی!
ہر تماشے میں دیکھنا کچھ اور

ہر طرف بھیر تھی طبیعوں کی
روگ بڑھتا چلا گیا کچھ اور

کٹ گئے دھار پہ زمانے کی
ہم سے امجد نہ موس کا کچھ اور

عمر ساری تضاد میں گزری
ہونا کچھ اور سوچنا کچھ اور

بھیر میں آنسوؤں کی سن نہ سکا
تم نے شاید کہا تو تھا کچھ اور

کم نہیں وصل سے فراق ترا
اس زباں میں ہے فائدہ کچھ اور

دل کسی شے پہ مطمئن ہی نہیں
مانگتا ہے یہ اژدہا، کچھ اور

تیرے غم میں حساب عمر رواں
جتنا جوڑا، بکھرا گیا کچھ اور

وصل کی رات کاٹنے والے
ہے شبِ غم کا ذائقہ کچھ اور

جو پیڑ پہ لکھی جاتی ہے، جو گیلی ریت سے بنتا ہے
 کون اُس تحریر کا وارث ہے! کون ایسے گھر میں رہتا ہے!

ہر شام، سُنگتی آنکھوں کو، دیوار میں چُن کر جاتی ہے
 ہر خواب، تکتے ہونے تک، زنجیر میں رہتا ہے!

یہ شہر کتنا بھی ہے امجد، اک قصہ سوتے جاگتے کا!
 ہم دیکھیں جس کردار کو بھی جاؤ کے اثر میں رہتا ہے

اک نام کی اُڑتی خوشبو میں اک خواب سفر میں رہتا ہے
 اک بستی آنکھیں ملتی ہے، اک شہر نظر میں رہتا ہے

کیا اہل ہنر، کیا اہل شرف، سب ٹکڑے رَدی کاغذ کے
 اِس دُور میں ہے وہ شخص بڑا جو روزِ خبر میں رہتا ہے

پانی میں روز بہاتا ہے اک شخص دیئے اُمیدوں کے
 اور اگلے دن تک پھر ان کے ہمراہ بھنور میں رہتا ہے

اک خواب ہنر کی آہٹ سے کیا آگ لہو میں جلتی ہے
 کیا لہر سی دل میں جلتی ہے! کیا نشہ سر میں رہتا ہے

سفر جاری اگر ہے رہنماؤ !
تو پھر کیوں فاصلہ گھٹاتا نہیں ہے

تم اپنے بادباں کھولو نہ کھولو
سمندر تو کبھی رکتا نہیں ہے !

ہری رہتی ہے کشتِ دل ہمیشہ
کسی رُت میں اسے چننا نہیں ہے

سحر سے شام ہونے لگی ہے
کوئی درد آشنا ملتا نہیں ہے

ہمارا دل ہے یوں قصرِ جہاں میں
وہ پتھر، جو کہیں لگتا نہیں ہے

ہوائے شامِ غم بوجھل ہے اتنی
چراغِ آرزو جلتا نہیں ہے

محبت کا ثمر ملتا نہیں ہے
یہ سکہ اب کہیں چلتا نہیں ہے

ہمیں کیا جو سخنِ دُنیا میں گونجا
جسے سُننا تھا وہ سُنتا نہیں ہے

ہم اہلِ دل، سہر بازارِ دُنیا
کھڑے ہیں، راستہ ملتا نہیں ہے

زمانہ آپ ہی بدلے تو بدلے
کسی کا زور تو چلتا نہیں ہے

نہیں امجد کوئی قیمت وفا کی
یہ سودا آب یہاں بکتا نہیں ہے



اک سراپِ بسیمیا میں رہ گئے
لوگ جو بیم و رحب میں رہ گئے

کس شبِ نغمہ کی ہیں یہ یادگار!
چند نوے جو ہوا میں رہ گئے

پنی لیے کچھ اشک پاسِ عشق نے
کچھ فشارِ التخب میں رہ گئے

کھو گئے کچھ حرفِ دشتِ ضبط میں
کچھ غنبارِ مدعا میں رہ گئے

چند جنتوں کا یہ سارا گھیل ہے
 رہ گئے، جوابتدائیں رہ گئے

سبز سایہ دار پیڑوں کی طرح
 رفتگان، دشتِ وفا میں رہ گئے

حاصلِ عمرِ رواں، وہ وقت، جو
 ہم تری آب و ہوا میں رہ گئے

ہے لہو کا قافلہ اب تک رواں
 اور تامل، کربلا میں رہ گئے

ہم ہیں امجد ان حقائق کی طرح
 جو بیانِ واقعہ میں رہ گئے



دستک کسی کی ہے کہ گماں دیکھنے تو دے!
 دروازہ ہم کو تیز ہوا، کھولنے تو دے!

اپنے لہو کی تال پہ خواہش کے مور کو،
 اے دشتِ احتیاط! کبھی ناچنے تو دے

اُسودا ہے عمر بھر کا، کوئی گھیل تو نہیں
 اے چشمِ یار، مجھ کو ذرا سوچنے تو دے!

اُس حرفِ کن کی ایک امانت ہے میرے پاس
 لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے!

شاید کسی کبیر میں لکھ ہوا میرا نام
اے دوست اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے تو دے

یہ سات آسمان کبھی مختصر تو ہوں
یہ گھومتی زمین کہیں ٹھہرنے تو دے!

کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بناؤں میں!
امجد وہ کوئی نقش کبھی بھولنے تو دے



عشق ایسا عجیب دریا ہے
جو بنا ساحلوں کے بہتا ہے

ہیں غنیمت یہ چار لمحے بھی
پھر نہ ہم ہیں، نہ یہ تماشا ہے

زندگی اک دکان کھلونوں کی
وقت، گھڑا ہوا سا بچہ ہے

اے سراپوں میں گھومنے والے!
دل کے اندر بھی ایک رستہ ہے

اس بھری کائنات کے ہوتے
آدمی، کس قدر، اکیلا ہے!!

آئنے میں جو عکس ہے امجد
کیوں کسی دوسرے کا لگتا ہے!



جو زخم تو نے دیئے تھے وہ بھرتے جاتے ہیں
چڑھے ہوئے تھے جو دریا، اترتے جاتے ہیں

سیمٹ لے مجھے بانہوں میں اے فراق کی رات
فلک پہ دیکھ ستارے پکھرتے جاتے ہیں

یہ اہل شہر وفا ہیں عجب بہار پرست
سروں کے پھول فصیلوں پہ دھرتے جاتے ہیں

نہیں ہے اور تو کچھ بھی ہمارے ہاتھوں میں
سوائے غرض تمنا، سو کرتے جاتے ہیں

عجیب لوگ ہیں یہ اہل انتظار کہ جو
خود اپنی آگ میں جل کر سنورتے جاتے ہیں

نجانے کون سی بستی کے ہیں یہ باشندے!
نظر اٹھاتے نہیں اور گزرتے جاتے ہیں

یہ آج شہر پہ اُتر ہی ہے کس بلا کی رات
چراغ اپنی لووں سے مکتے جاتے ہیں

درخت شام کو لگتے ہیں شہر سے امجد
کہ شاخ شاخ پرندے اُرتے جاتے ہیں

سب ہیں بکنے والے ہاتھ
کیا تیرے، کیا میرے ہاتھ

لہو نہ مُخبہ ہو جائے
دیکھو اپنے اپنے ہاتھ

بول فنا کے لمحے، بول
منزل ہے اب رکتے ہاتھ!

رُکے نہیں اور جھکے نہیں
سچی باتیں رکھتے ہاتھ

کس سے ہیں انصاف طلب!
سہمی حینیں، پھیلے ہاتھ

ہاتھوں ہاتھ نکل جائیں
نقلی موتی، جھوٹے ہاتھ

چھین جھپٹ کا موسم ہے
کون لگے گا، کس کے ہاتھ

(ق)

گھر کی خاطر گھر سے دور
تھک گئے اینٹیں چنتے ہاتھ

ریگ رواں کا رزق ہوئے
صحرا صحرا، رکتے ہاتھ

پیٹ جسم بھرنے کو
جنت چھوڑ کے نکلے ہاتھ

رنگوں کی آواز سُنی
دیکھے باتیں کرتے ہاتھ!

(ق)

کس سے مل کر جھومادل (P)
کس کو چھو کر مہکے ہاتھ

پوریں جگنو ہو جائیں
کنج بدن میں بھٹکے ہاتھ

(ق)

اہل ہنر نے دیکھو تو!
کس کس بھاؤ نیچے ہاتھ

مفلس کی بیٹی، قانون
چوروں کے ہیں لمبے ہاتھ

انت امانت مٹی کی
کیا مہنگے، کیا ستے ہاتھ

امجد ہاتھ سے چھوٹا پیل
کب آتا ہے مڑ کے ہاتھ



ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے دیکھ تو آئیں
چلو اُس شہر کو اک بار پھر سے دیکھ تو آئیں

بہت دن سے سمند کی ہوا گم سم سی آتی ہے
نہ ہوں طوفان کے رُخ پر سفینے دیکھ تو آئیں

کسی دن آرزوں کے کھنڈر میں جھانک کر ہم بھی
درو دیوار پر کیا کیا ہیں جالے دیکھ تو آئیں

ہوا میں ڈولتی خوشبو پتہ خود ہی بتا دے گی
چلو رستوں پہ تھوڑی دور چل کے دیکھ تو آئیں

۱۷۰
 A ہمارا نام سنتے ہی کسی مہوش کی آنکھوں میں
 چمک اٹھتے ہیں کیا اب بھی ستارے دیکھ تو آئیں

A بہت دُھندلے سہی شیشے سر بزم و فانا مجد
 لگراک بار وہ گم گشتہ چہرے دیکھ تو آئیں

۱۷۱
 بدن سے اٹھتی تھی اُس کے خوشبو صبا کے لہجے میں بولتا تھا
 یہ میری آنکھیں تھیں اُس کا بستر، وہ میرے خوابوں میں جاگتا تھا

✓ جیساے پلکیں جھکی ہوئی تھیں، ہو اکی سانسیں رُکی ہوئی تھیں
 وہ میرے سینے میں سر چھپائے، نجانے کیا بات سوچتا تھا!

✓ کوئی تھا چشمِ کرم کا طالب، کسی پہ شوقِ وصال غالب
 سوال پھیلے تھے چار جانب، بس ایک میں تھا جو چُپ کھڑا تھا

✓ عجیب صحبت، عجیب رت تھی، خموش بیٹھے ہوئے تھے دونوں
 میں اُس کی آواز سن رہا تھا، وہ میری آواز سن رہا تھا

بہار آئی تو تتلیوں کے پروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنورا کلی کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چومتا تھا

وہ اور ہوں گے کہ جن کو اجد نئے مناظر کی چاہ ہوگی
میں اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا

یہ کون آج مری آنکھ کے حصار میں ہے
مجھے لگا کہ زمیں میرے اختیار میں ہے

چراغِ رنگِ نوا، اب کہیں سے روشن ہو
سکوتِ شامِ سفر، کب سے انتظار میں ہے

کچھ اس طرح ہے تری بزم میں یہ دل جیسے
چراغِ شامِ خزاں، جشنِ نو بہار میں ہے

میری حیات کے سارے سفر پہ بھاری ہے
وہ ایک پل جو تری چشمِ اعتبار میں ہے

جو اُٹھ رہا ہے کسی بے نشان صحرا میں
نشانِ منزل ہستی اُسی غمبار میں ہے

ہماری کشتی دل میں بھی اب نہیں وہ زور
تمہارے حُسن کا دریا بھی اب اتار میں ہے

کبھی ہے دُھوپ کبھی ابرِ خوش نما اجمد
عجب طرح کا تلون مزارِ یار میں ہے

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہیں تو آزما کر دیکھ لو، کیسے بدلتا ہے
تمہارے مسکرانے سے دلِ ناشاد کا موسم

صدائیتنے سے جو نکلی، دلِ شیریں سے اُٹھی تھی
چمنِ خسرو کا تھا لیکن رہا فرہاد کا موسم

پزندوں کی زباں بدلی کہیں سے ڈھونڈ لے تو بھی
نئی طرزِ نغماں لے دل کہ ہے ایجاد کا موسم

رُتوں کا قاعدہ ہے وقت پر یہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رُک گیا فریاد کا موسم

کہیں سے اُس حسین آواز کی خوشبو پکارے گی
تو اُس کے ساتھ بدلے گا دلِ برباد کا موسم

قفص کے بام و در میں روشنی سی آئی جاتی ہے
چمن میں آگیا شاید لبِ آزاد کا موسم

سہ مرے شہر پر نشیاں تری بے چاند راتوں میں
بہت ہی یاد کرتا ہوں تری بنیاد کا موسم

نہ کوئی غم خنزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

ہیں سنگ میں بھی ہے روشنی کہیں آگ میں بھی دُھواں نہیں
یہ عجیب شہرِ طلسم ہے! کہیں آدمی کا نشان نہیں

نہی اس زمین کے نشیب میں نہ ہی آسماں کے فراز پر
لٹی عمر اُس کو تلاشتے، جو کہیں نہیں پہ کہاں نہیں؟

یہ جو زندگانی کا کھیل ہے، عزم و انبساط کا میل ہے
اُسے قدر کیا ہو بہار کی! کبھی دیکھی جس نے خزاں نہیں

وہ جو کٹ کرے پہ نہ جھک سکے جو نہ مقتول سے بھی رُک سکے
کوئی ایسا سر نہیں دوش پر، کسی مُنہ میں ایسی زباں نہیں

جو تھے اشک میں نے وہ پی لینے لب خشک سوختہ سی پیل
 مرے زخم پھر بھی عیاں رہے، مراد درد پھر بھی نہاں نہیہ
 نہیں اس کو عشق سے واسطہ وہ ہے اور ہی کوئی راستہ
 اگر اس میں دل کا لہو نہیں اگر اس میں جاں کا زیاں نہیہ



بوں پہ پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے
 دلوں کے دیپ جلتے ہیں چراغِ شام سے پہلے
 کبھی منظر بدلنے پر بھی قصہ چل نہیں پانا
 کہانی ختم ہوئی ہے کبھی انجام سے پہلے
 یہی تارے تمھاری آنکھ کی چلن میں رہتے تھے
 یہی سورج نکلتا تھا تمھارے بام سے پہلے
 دلوں کی جگہ گاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں
 یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے پہلے

ہوئی ہے شام جنگل میں پرندے لوٹتے ہوں گے
اب اُن کو کس طرح روکیں نواحِ دام سے پہلے

یہ سائے رنگِ مُردہ تھے تمھاری شکل بننے تک
یہ سائے حرفِ مہمل تھے تمھارے نام سے پہلے

ہوا ہے وہ اگر مُنصف تو اجمد احتیاطاً ہم
سنزاسیم کرتے ہیں کسی الزام سے پہلے



خزاں کی دُھند میں پلٹے ہوئے ہیں
شجرِ محبوبیاں پہننے ہوئے ہیں
یہ کیسی فصلِ گلِ آئی چسمن ہیں
پرندے خوف سے سمے ہوئے ہیں
ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دلوں کے بادباں سٹے ہوئے ہیں
ہمائے خواب ہیں مگر ٹی کے جالے
ہم اپنے آپ میں اُٹھے ہوئے ہیں
دکتے، گنگناتے، موسموں کے
لہو میں ذائقے پھیلے ہوئے ہیں

مری صُوت، زمیں کے سارے منظر
 ترے دیدار کو ترسے ہوئے ہیں
 مثالِ نقشِ پا، حیران تیرے!
 ہوا کی راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں
 نگاہوں سے کہو، ہم کو سمیٹیں
 مری جاں، ہم بہت بکھرے ہوئے ہیں
 ادھوری خواہشوں کا عزم نہ کرنا
 کہ سارے خواب کب پوئے ہوئے ہیں!
 سمندر، آسماں اور سانس میرا
 تری آواز پر ٹھہرے ہوئے ہیں
 ہر اک رستے پہ کہتی ہیں یہ آنکھیں
 یہ منظر تو کہیں دیکھے ہوئے ہیں!
 ستارے آسماں کے، دیکھ امجد
 کسی کی آنکھ میں اُترے ہوئے ہیں

اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں
 پھر بھی ہم مُسکرائے جاتے ہیں
 دُشتِ بے سائباں میں ہم تیری
 یاد کے سائے سائے جاتے ہیں
 کوئی سُننا نہیں کسی کی بات
 اپنی اپنی سُنائے جاتے ہیں

پردے میں ایک مُسکراہٹ کے
کتنے آنسو چھپائے جاتے ہیں

کون آیا ہے رُوبرو اِحد
آنے جگمگائے جاتے ہیں

قصہ شہابی سے کب رُکے وہ سوال
جو سڑک پر اُٹھائے جاتے ہیں

ایسے جھکتی ہیں مہرباں آنکھیں
جیسے بادل سے چھائے جاتے ہیں

نہ سہی، زور گر ہوا پہ نہیں
ہم دیا تو جلائے جاتے ہیں

راستہ صاف ہو نہ ہو لیکن
ہم تو یہ تھہرے جاتے ہیں

ہم سناتے ہیں حال دل اپنا
اور وہ مُسکرائے جاتے ہیں

پھیلتی جا رہی ہے تنہائی
شہر میں لوگ آئے جاتے ہیں

اب تو اُس کے دنوں میں بہت دُور تک آسماں ہیں نئے اونٹنی دُھوپ ہے
اب کہاں یاد ہوگی اُسے رات وہ جس کو گزرے ہوئے اک زمانہ ہوا

مہم وصل میں خوب سماں ہوئے ہم جو فصل بہاراں کے مہماں ہوئے
لہاسِ قایلین کی طرح بجھتی گئی، سر پہ ابرِ رواں، شامیانہ ہوا

ب تو اجدِ جدائی کے اُس موڑ تک دُرد کی دُھند ہے اور کچھ بھی نہیں
بانِ من، اب وہ دن لوٹنے کے نہیں، چھوڑیئے اب وہ قصہ پرانا ہوا

وہ دکتی ہوئی کو کہانی ہوئی وہ چمک دار شعلہ، فسانہ ہوا
وہ جو اُلجھا تھا وحشی ہوا سے کبھی، اُس دے کو بچھے تو زمانہ ہوا

ایک خوشبو سی پھیلی ہے چاروں طرف اُس کے امکان کی اُس کے اعلان کا
رابطہ پھر بھی اُس حسنِ بے نام سے جس کا جتنا ہوا، غائبانہ ہوا

باغ میں پُچھول اُس رُز جو بھی کھلا اُس کے بالوں میں سینے کو بے چین
جو تارا بھی اُس رات روشن ہوا، اُس کی آنکھوں کی جانب لوٹنا

لکشاں سے پرئے آسماں سے پرئے رگہزارِ زمان و مکاں سے پرئے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہوا

کہانی ایک ہے لیکن، جدا ہیں واقعے اپنے
تھیں محشر اٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے

تمنا نے ہمیں پایا، تغافل اُن کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجد کسی پیکر میں رہنا ہے



کسی کی دُھن میں جینا ہے، کسی کے ڈر میں رہنا ہے
بتا اے زندگی کب تک اسی چکر میں رہنا ہے

دھنک بنیاد تھی جن کی وہ بام و در نہ بن پائے
تذبذب نام ہے جس کا ہمیں اُس گھر میں رہنا ہے

تمنا اور حسرت میں ہے سرق اظہار کا، یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اُسے تپسہ میں رہنا ہے

ترے باغِ توحب کی فضا میں زندگی کرنا
رمِ خوشبو میں چلنا ہے گلِ منظر میں رہنا ہے

کس قدر سلسلے نکل آئے
 لرزشِ چشمِ نیمِ واسے ہی
 پھول سے رُتے، باغبان سے نہیں
 اپنا شکوہ تو ہے صبا سے ہی
 رسم یہ حق پہ جان دینے کی
 ہم نے سیکھی ہے کربلا سے ہی
 خود جینو، دوسروں کو جینے دو
 اپنی عادت ہے یہ سدا سے ہی
 ہنر و مرتبہ نہیں مخصوص
 جذبہ و خلعت و قبا سے ہی
 کتنے ہی بے جہت نہ کیوں ہو جائیں!
 اپنا رشتہ تو ہے خدا سے ہی
 سینکڑوں بار مل چکے ہوتے
 آپ ملتے اگر دعا سے ہی!

ایک احساسِ دل کُشا سے ہی
 کھل اٹھا دل تری صدا سے ہی
 مدعا، حرفِ نارسانی کو
 بل گیا عرضِ مدعا سے ہی
 شاخ در شاخِ زندگی جاگی
 موسمِ سبز کی ہوا سے ہی

درد کی آبرو نہیں رہتی

نیرتِ حرفِ التجا سے ہی

وہ دورا ہا بھی آگیا المجد

جس کا دھڑکا تھا ابتدا سے ہی



ہم تھے، ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا
ایسا حسین دن کہیں دیکھا سنا نہ تھا

آنکھوں میں اُس کی تیر رہے تھے جیا کے رنگ
پلکیں اٹھا کے میری طرف دیکھتا نہ تھا

چھ ایسے اُس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

(ہے عشق ایک روگِ محبتِ عذاب ہے)
 اک روز یہ خراب کریں گے ، کہا نہ تھا!

۱۱ امجد وہاں پہ حد کوئی رہتی بھی کس طرح
 رکنے کو کہہ رہا تھا مگر روکتا نہ تھا

ہاتھوں میں دیر تک کوئی خوشبو بسی رہی
 دروازہ چمن تھا وہ بندِ قبا نہ تھا

۱۲ اُس کے تو انگ انگ میں جلنے لگے دیے
 جاؤ وہ میرے ہاتھ میں مجھ کو پتا نہ تھا

۱۳ اُس کے بدن کی لُو سے تھی کمرے میں روشنی
 کھڑکی میں چاند ، طاق میں کوئی دیا نہ تھا

۱۴ کل رات وہ نگار ہوا ایسا ملتفت
 عکسوں کے زربیان ، کوئی آئینہ نہ تھا

۱۵ سانسوں میں تھے گلاب تو ہونٹوں پہ چاندنی
 ان منظروں سے میں تو کبھی آشنا نہ تھا

۱۶ رویا کچھ اس طرح ہرے نشانے سے لگے وہ
 ایسے لگا کہ جیسے کبھی بے وفا نہ تھا

عمر رواں کے زخمت میں ایسا نہیں کوئی
جو پل تمھاری یاد سے باہر، بسر ہوا

خوشبو تھی جو خیال میں، رزقِ اہم ہوئی
جو رنگِ اعتبار تھا، گردِ سفر ہوا

دل کی گلی میں حدِ نظر تک تھی روشنی
کر نہیں سفیر چاند ترانا نامہ بر ہوا

تارے مرے وکیل تھے، خوشبو تری گواہ
کل شبِ عجب معاملہ، پیشِ نظر ہوا

امجد اگر وہ دور جنوں جا چکا، تو پھر
بہجے میں کیوں یہ فرق کسی نام پر ہوا

قاصد جو تھا بہار کا نام معتبر ہوا
گلشن میں بند و بستِ برنگِ دیگر ہوا

خواہش جو شاخِ حرف پہ چٹکی، بکھر گئی
آنسو جو دل میں بند رہا، وہ گھر ہوا

اک منحرف گواہ کی صورت، چراغِ شام
اُس کی گلی میں رات مرا ہم سفر ہوا

آواز کیا کہ شکل بھی پہچانتا نہیں
غافل ہمارے حال سے وہ اس قدر ہوا

مخراپ جاں کی شمعیں بچانے کے واسطے
 ہر رات کنجِ غم میں بگھلنا پڑا ہمیں
 ہم چڑھتے سُورجوں کو سلامی نہ دے سکے
 سو دوپہر کی دھوپ میں جلنا پڑا ہمیں

تھا ابتدا سے علم کہ ہے راستہ غلط
 اور قافلے کے ساتھ بھی چلنا پڑا ہمیں
 شانے پہ اس ادا سے رکھا پھر کسی نے ہاتھ
 دل ماننا نہ تھا پہ پہلنا پڑا ہمیں
 اجد کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
 جب بھی گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں



ویرانہ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
 اپنے لہو کی آگ میں جلنا پڑا ہمیں
 منزل بہت ہی دور تھی رتے تھے اجنبی
 تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں
 سایا مثال آئے تھے اُس کی گلی میں ہم
 ڈھلنے لگی جو شام تو دھلنا پڑا ہمیں
 اپنے کہے سے وہ جو ہوا منحرف تو پھر
 اپنا لکھا ہوا بھی بدلنا پڑا ہمیں

تری بے رنجی کے دیار میں، گھنی تیرگی کے حصا میں
جلے کس طرح سے چراغ جاں اکرے کس طرف کو سفر کوئی!

اکٹے وقت چاہے عذاب میں کسی خواب میں یا سرب میں
جو نظر سے دور نکل گیا اُسے یاد کرتا ہے ہر کوئی

سہ بزم جتنے چراغ تھے وہ تمام رمز شناس تھے
تری چشمِ خوش کے لحاظ سے نہیں بولتا تھا مگر کوئی



سہ طاق جاں نہ چراغ ہے پس بامِ شب نہ سحر کوئی
عجب ایک عرصہ درد ہے، نہ گمان ہے نہ خبر کوئی

نہیں اب تو کوئی ملال بھی کسی واپسی کا خیال بھی
غم بے کسی نے مٹا دیا مرے دل میں تھا بھی اگر کوئی

تجھے کیا خبر ہے کہ رات بھر تجھے دیکھ پانے کو اک نظر
رہا ساتھ چاند کے منتظر تری کھڑکیوں سے اُدھر کوئی

سہ شاخ جاں ترے نام کا عجب ایک تازہ گلاب تھا
جسے آنڈھیوں سے خطر نہ تھا جسے تھا خزاں کا نہ ڈر کوئی

آئے بھی نہ روک پائے اُسے
وقت کچھ اس طرح سے چلتا رہا

بات کا رخ کبھی، کبھی پہلو
ہجر کی شام وہ بدلتا رہا

شام بچھتی، چیراغ جلتا رہا
قافلہ، زندگی کا چلتا رہا

شاد تھا رنج رہگزر میں کوئی!
کوئی منزل پہ ہاتھ ملتا رہا

دھوپ تھی جس نگر میں، کم نہ ہوئی
سایہ آفتاب، ڈھلتا رہا

بچھ گئے تھے، دیے بھی تارے بھی
اک مہرِ خواب تھا کہ جلتا رہا

موسمِ عشق کی آہٹ سے ہی ہر اک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں

دنیا کے اس شور نے امجد کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
عود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہو جاتے ہیں

✓ ہر پل دھیان میں بنے والے لوگ افسانے ہو جاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں خواب پرانے ہو جاتے ہیں

رساری بات تعلق والی جذبوں کی سچائی تک ہے
میل دلوں میں آجائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

منظر منظر کھل اٹھتی ہے پیراہن کی قوس قرن
موسم تیرے ہنس پڑنے سے اور سہانے ہو جاتے ہیں

جھونپڑیوں میں ہر اک تلخی پیدا ہوتے مل جاتی ہے
اسی لیے تو وقت سے پہلے طفلِ سیا نے ہو جاتے ہیں

اسی خاکداں کے حصار میں
مری خواہشوں کا جہان بھی

مری گم رہی کے غبار میں
مری منزلوں کے نشان بھی

عجب اُس کا رنگِ جمال ہے ✓
کہ چمک اٹھا ہے مکان بھی

عجب اُس حسین کا خیال ہے ✓
کہ مہاک رہا ہے گمان بھی

اسی آسمان کی چھت تلی
میرا آشیباں بھی، اُڑان بھی

ترے اک اشارے کے منظر
یہ زمین بھی یہ زمان بھی



نہیں اب جہاں پہ نشان بھی
یہاں لوگ بھی تھے مکان بھی

مری آرزو میں جئے گا وہ ✓
مجھے کب تھا ایسا گمان بھی!

تری بے رخی کے فشار سے
کبھی مل سکے گی امان بھی؟

ترے چشمِ خوش کی پناہ میں
مرے خواب بھی مرے مان بھی

میں جہاں گیا مرے ساتھ تھی
مری عمر بھر کی تھکان بھی

کہیں بے کنار سے رتجگے، کہیں زرنکار سے خواب دے!
تو کیا اصول ہے زندگی؟ مجھے کون اس کا جواب دے!

جو بچھا سکوں ترے واسطے، جو سجا سکیں ترے راستے،
مری دسترس میں تارے رکھ، مری ٹٹھیوں کو گلاب دے

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اڑے گا اپنی ہی موج میں، اسے آب دے کہ سراب دے!

تجھے چھو بپا تو بھڑک اٹھے مرے جسم و جاں میں چراغ سے ر
اسی آگ میں مجھے راکھ کر، اسی شعلگی کو شباب دے

کبھی یوں بھی ہو ترے رُوبرو، میں نظرِ بلا کے یہ کہہ سکوں
 ”مری حسرتوں کو شمار کر، مری خواہشوں کا حساب دے“

ترجمی اک نگاہ کے فیض سے مری کشتِ حرف چمک اُٹھے
 میرا لفظ لفظ ہو کہشاں مجھے ایک ایسی کتاب دے

مکمل نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا
 ہم نے تجھے بھلانے کا وعدہ نہیں کیا

لہجے میں اُس کے رنگ تھا کم اعتماد کا
 ہم نے بھی اعتراف زیادہ نہیں کیا

تجھے مصلحت کی راہ میں سائے بہت گھنے
 پردل نے اختیار وہ جاوہ نہیں کیا

جھولی میں ہم نے بھر لیے فاتحے سمیٹ کر
 دامن کسی کے آگے کٹا وہ نہیں کیا

تھے، خاکِ پائے اہلِ عجت ، مگر کبھی
 سجدہ، بہ پیشِ تاج و لبادہ نہیں کیا
 حرمتِ شناسِ درد تھے، سو ہم نے عُمر بھر
 اجمد، حدیثِ جاں کا اعادہ نہیں کیا



بھنور میں کھو گئے ایک ایک کر کے ڈوبنے والے
 سہر سائل کھڑے تھے سب تماشا دیکھنے والے

خدا کا رزق تو ہرگز زمیں پر کم نہیں یارو!
 مگر یہ کاٹنے والے! مگر یہ بانٹنے والے!

کہاں یہ عشق کا سنگِ گراں ہر اک سے اٹھتا ہے!
 بہت سے لوگ تھے یوں تو یہ پتھر چوڑے منے والے

وفا کی راہ متقل سے گزرتی ہے تو بسم اللہ،
نہیں پپائی سے واقف تھاکے چاہنے والے

۴ ازل سے ظلم دیکھے جا رہی ہیں، دیکھتی آنکھیں
ازل سے سوچ میں ڈوبے ہیں امجد، سوچنے والے



کوئی بجر تھا نہ وصال تھا مرے سامنے
بری آرزوں کا جال تھا مرے سامنے

اے گرا ہوں کتنی ہی مرتبہ پر رُک کا نہیں
مگر ایک تیرا خیال تھا مرے سامنے

کسی آنکھ میں نہ تھی روشنی، کسی خواب کی
عجب ایک شہرِ ملال تھا مرے سامنے

لیے انگ انگ میں پیاس سی، سہرِ شام وہ
بری خواہشوں کی مثال تھا مرے سامنے



جہاں کشتی رُکی میری کنار اور تھا کوئی
چسے میں دوست سمجھا تھا ستارا اور تھا کوئی

فلک کی بالکونی میں خُدا خاموش بیٹھا تھا
تو کیا ان گرنے والوں کا سہارا اور تھا کوئی!

بُجھی آنکھوں کے دامن میں جمی تھی دُھول برسوں کی
وہ چہرہ اب جو دیکھا ہے دوبارہ، اور تھا کوئی

بہت عادل سہی مُنصف، مگر انصاف کیسے ہوا
گواہی اور ہے، قاتل ہمارا، اور تھا کوئی!

مجھے رات اپنی نگاہ پہ بھی لیتیں نہ تھا
کوئی معجزوں سا کمال تھا مرے سامنے

سہر بزم جب کسی آٹنے پہ نظر پڑی
وہی ایک عکس جمال تھا مرے سامنے

وہی ایک چُپ کا غبار تھا پس چشمِ نم
وہی ایک تشنہ سوال تھا مرے سامنے!

ہوا کی سمت دیکھی اور کشتی ڈال دی ہم نے
کھلا آکر سمندر میں اشارا اور تھا کوئی

نضا مہکی، چمن جاگا، اچانک کھل اٹھے تارے
کسی کے مسکراتے ہی نظارا اور تھا کوئی

وہی مانوس لہجہ تھا، وہی آواز تھی امجد
مگر جو مڑ کے دیکھا تو پکارا اور تھا کوئی

حد سے حد، حد گماں تک کوئی جاسکتا ہے
ڈھونڈنے اُس کو کہاں تک کوئی جاسکتا ہے!

انکشاں کون سی اُس حُسن کے حلقے میں نہیں!
ہاں چلا جائے، جہاں تک کوئی جاسکتا ہے

کسی مانوس سے لہجے کا اشارا مل جائے
معجزہ ہائے بیاں تک کوئی جاسکتا ہے

نشئی شوق ہے خطرے کے نشاں سے آگے
اور خطرے کے نشاں تک کوئی جاسکتا ہے

پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت وہ اُرتے گیسو
رات کے ساتھ کہاں تک کوئی جاسکتا ہے

مرتبہ میرا یہی ہے کہ زمیں زاد ہوں میں
سو وہاں ہوں کہ جہاں تک کوئی جاسکتا ہے

راتے عشق کے آسان نہیں ہیں، اجمد
ہاں مگر جاں کے زیاں تک کوئی جاسکتا ہے

زیرِ لب یہ جو تبسم کا دیا رکھا ہے
ہے کوئی بات جسے تم نے چھپا رکھا ہے

چند بے ربط سے صفحات میں کتاب جاں کے
اک نشانی کی طرح عہد و وفا رکھا ہے

ایک ہی شکل نظر آتی ہے، جاگے، سوئے
تم نے جادو سا کوئی مجھ پہ چلا رکھا ہے

یہ جو اک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ ہمت پوچھ
کس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکھا ہے!

ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے
 رنگ کو روشنی میں کھونا ہے
 جاگنا ہے غمبار میں ، ہم کو
 خاک کی تیسرگی میں سونا ہے
 کتنی راتوں کو کرگیں جل تھل
 ایک آنسو ابھی جو رونا ہے
 عمر کی قیبر بامشقت میں
 جسم کا بوجھ ہم کو ڈھونا ہے

کیسے خوشبو کو بکھر جانے سے روکے کوئی!
 رزقِ غنچہ اسی گٹھڑی میں بندھا رکھا ہے

کب سے احبابِ رحمت حلقہ کیے بیٹھے تھے
 وہ چراغِ آج سہرا ہوا، رکھا ہے

دن میں سائے کی طرح ساتھ رہا، لشکرِ غم
 رات نے اور ہی طوفان اٹھا رکھا ہے

یاد بھی آتا نہیں اب کہ گلے تھے کیا کیا
 سب کو اُس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

دل میں خوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں، اجد
 ہم نے اس دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

خدا لہو سے مہیا



تُو نہیں، تیرا استعارا نہیں

آسماں پر کوئی ستارا نہیں

وہ میرے سامنے سے گزرا تھا

پھر بھی میں چُپ رہا، پکارا نہیں

وہ نہیں ملتا ایک بار ہمیں

اور یہ زندگی دوبارہ نہیں

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے

ہجر کی رات کا کنارہ نہیں

وقت اور بخت کے تعلق میں

ایک بچہ ہے اک کھلونا ہے

تیری آنکھوں کے کج خوشبو میں

ہم کو بھی ایک خواب ہونا ہے

اے مری چشم تر، بتا تو سہی

کون سا داغ ہے جو دھونا ہے!

۱۲
 رہو سکے تو نگاہ کر لینا
 تم پہ کچھ زور تو ہمارا نہیں
 ناؤ اٹھی تو یہ ہوا معلوم
 زندگی موج ہے، کنارہ نہیں!



۱۱ مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے

ہے عشق مگر اتنا زیادہ بھی نہیں ہے

۱۰ ہے یوں کہ عبارت کی زباں اور ہے کوئی

کاغذ میری تفتدیر کا سادا بھی نہیں ہے

۹ کیوں دیکھتے رہتے ہیں ستاروں کی طرف ہم!

جب ان سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں ہے!

۸ کیوں راہ کے منظر میں الجھ جاتی ہیں آنکھیں!

جب دل میں کوئی اور ارادہ بھی نہیں ہے!

کیوں اُس کی طرف دیکھ کے پاؤں نہیں اُٹھتے
وہ شخص حسین اتنا زیادہ بھی نہیں ہے

کس موڑ پہ لے آیا ہمیں سحرِ مسلسل!
تا حدِ نگہ وصل کا وعدہ بھی نہیں ہے

پتھر کی طرح سرد ہے کیوں آنکھ کسی کی!
امجد جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے



دُور تک ویرانہ ہے
کب تک چلتے جانا ہے!
آئینے کے ہاتھوں میں
مقتل کا پروانہ ہے
جانے والو، یاد رہے
شام ڈھلے گھر آنا ہے
فرق ہے کچھ کرداروں میں
باقی کھیل پرانا ہے

سچی باتیں کون کرے
 کون یہاں دیوانہ ہے!
 تجھ سا دُجا دیکھنے کو
 سارا عالم چھانا ہے
 مٹی بھی ہے، سونا بھی
 دل بھی عجب خزانہ ہے



مقل میں بھی اہل جنوں ہیں کیسے غزل خواں، دیکھو تو!
 ہم پہ پتھر پھینکنے والو، اپنے گریباں، دیکھو تو!
 ہم بھی اڑائیں خاکِ بیاباں، دُشت سے تم گُزرو تو سہی
 ہم بھی دکھائیں چاکِ گریباں، لیکن جاناں، دیکھو تو!
 اسے تعبیریں کرنے والو، ہستی مانا خواب سہی
 اس کی رات میں جاگو تو، یہ خواب پریشاں دیکھو تو!
 آج تارے گمِ صُغم ہیں کیوں، چاند ہے کیوں سو دائی سا
 آئینے سے بات کرو، اس بھید کا عنوان دیکھو تو!

کس کے حُسن کی بستی ہے یہ! کس کے رُوپ کا میلہ ہے!
 آنکھ اٹھا اے حُسنِ زلیخا، یوسفِ کنانا، دیکھو تو
 جو بھی علاجِ دزدِ کرو میں حاضر ہوں ہنظو مجھے
 لیکن اک شبِ امجدِ جی، وہ چہرہ تاباں، دیکھو تو!



کس رات کی آنکھوں میں بیجانِ سحر ہوگا!
 یہ خواب جو کونیل ہے، کس رت میں شجر ہوگا!
 آنچل کی ہوار کھنا، تو اس کی بچار کھنا
 یہ شمعِ جدھر ہوگی، پروانہ اُدھر ہوگا
 جب رات کے پردے سے پھر رات نکلی آئے
 اُس وقت کدھر جائے، جو اہل نظر ہوگا
 تاریخ کے چپکڑے میں وہ موڑ نہیں آتا
 جب شاہِ دیکھیں ہوں گے، آباد نگر ہوگا



کون سی چیز دل کے بس میں نہیں
دل مگر اپنی دسترس میں نہیں

یہ تو ہم ہیں، جو خار و خس میں ہیں
منزلِ گل تو خار و خس میں نہیں!

کب سے آنکھیں تلاشتی ہیں اُسے
ایک دن، جو کسی برس میں نہیں

جسمِ کتنی بڑی حقیقت ہو!
دل کی تسکین مگر ہوس میں نہیں

بجھتے ہوئے تاروں کی، جھلمل بھی غنیمت ہے
اس ٹھہری ہوئی شب میں کچھ وہم سفر ہوگا

افکار پہ پہرا ہے، فانون یہ ٹھہرا ہے
جو صاحبِ عزت ہے وہ شہر بدر ہوگا

محسوس یہ ہوتا ہے، ہر جلتا ہوتا را
گزرے ہوئے وقتوں میں اک زخم ہنر ہوگا

سہمے ہوئے پنچھی کی آواز بتاتی ہے!
اُس کا بھی یہیں کوئی، جلتا ہوا گھر ہوگا

کامراں ، عاشقی کی منزل میں
 ہے وہی دل جو پیش و پس میں نہیں
 دیکھ لی جنستری زمانے کی
 وصل کا دن کسی برس میں نہیں

(ق)

نار سائی کی دُھند کے اُس پار
 عشق میں کیا ہے جو ہوس میں نہیں!
 لذتِ پر کشادگی کے سوا!
 باغ میں کیا ہے جو قفس میں نہیں!

○
 پیر کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
 دونوں ہی کو اِحباب ہم نے بچتے دیکھا کم

تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا
 سُوج کی بس ایک کرن سے گھٹ جاتا ہے دم

زنگوں کو کلیوں میں جینا کون رکھتا ہے!
 شبنم کیسے رکنا سیکھی! تتلی کیسے رم!

آنکھوں میں یہ پلنے والے خواب بگھنے پائیں،
دل کے چاند چراغ کی دیکھو، کو نہ ہو مدھم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انسان
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم!



بڑے کیسے صدیوں کی پیاس اور پانی، ذرا پھر سے کہنا
بڑی دُربا ہے یہ ساری کہانی، ذرا پھر سے کہنا

کہاں سے چلا تھا حُبِ رائی کا سایا، نہیں دیکھ پایا
کہرتے میں تھی آنسوؤں کی روانی، ذرا پھر سے کہنا

ہوایا یہ خُبر تو سنا تی رہے اور میں سُننا رہوں
بدلتے کو ہے اب یہ موسمِ خزانہ، ذرا پھر سے کہنا

مگر جانے والا کبھی زندگی میں، خوشی پھر نہ پائے
یونہی ختم کر لیں، چلو یہ کہانی، ذرا پھر سے کہ

سے کے سمندر! کہا تو نے جو بھی، سنا، پر نہ بچ
جوانی کی تندی، میں تھا تیسرا پانی، ذرا پھر سے کہ

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ ادھر سے
لیکن تری خوشبو نہ گئی، راہ گزر سے

کیوں ڈوبتی، بھتی ہوئی آنکھوں میں ہے روشن
راتوں کو شکایت ہے تو اتنی ہے سحر سے!

لڑا تھا بدن اُس کا مرے ہاتھ سے چھو کر
دیکھا تھا مجھے اُس نے عجب مست نظر سے

کیا ٹھان کے نکلا تھا، کہاں آ کے پڑا ہے!
پوچھے تو کوئی اس دل شرمندہ سفر سے

آیا ہے بہت دیر میں وہ شخص، پر اُس کو
جذبات کی اس بھیڑ میں دیکھوں میں کدھر سے

ہم رزق گزرگاہ تو خاشاک تھے، بسکین!
وہ لوگ، جو نکلے تھے ہوا دیکھ کے گھر سے!

ایسا تو نہیں، میری طرح سر و لب جُو!
قدموں پہ کھڑا ہو کسی اُفتاد کے ڈر سے
دن تھے کہ ہمیں شہر بدن تک کی خبر تھی
اور اب نہیں آگاہ تری خیر خبر سے

A امجد نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

دربار کی ہوا تیز تھی، کشتی تھی پرانی
رڈ کا تو بہت، دل نے مگر ایک نہ مانی

سائیں بھیگتی آنکھوں سے اُسے کیسے ہٹاؤں
مشکل ہے بہت ابر میں دیوار اُٹھانی

کلا نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے اک ہجر کا تارا
پھر اُس کے تعاقب میں گئی، ساری جوانی

کہنے کو نئی بات کوئی ہو تو سنائیں
سو بار زمانے نے سنی ہے یہ کہانی!

یہ پل ہے یہاں پھول کہاں پچھلے برس کے
ہے دن تو وہی دوست، مگر اور ہے پانی

کس طرح مجھے ہونا گمان، ترکِ وفا کا
آواز میں ٹھہراؤ تھا، لہجے میں روانی

اب میں اُسے قاتل کہوں امجد کہ میما
کیا زخم ہنر چھوڑ گیا، اپنی نشانی!

ترمی زد سے نکلنا چاہتا ہے ✓

یہ دریا رخ بدلنا چاہتا ہے

وہ سینا، جس کی صوت ہی نہیں ہے

مری آنکھوں میں پلنا چاہتا ہے

دلوں کی ماندگی پہ کیا تعجب!

کہ سورج بھی تو ڈھلنا چاہتا ہے

نشست درد بدلی ہے تو اب دل

ذرا پہلو بدلنا چاہتا ہے

ہوا ہے بند اور شعلہ و ف کا

بہت ہی تیز جلنا چاہتا ہے

یہ دل اس گردبادِ زندگی میں
بس اک لمحہ سنبھلنا چاہتا ہے

مجھے بھی سنا منا ہے کربلا کا
مرا سر بھی اچھلنا چاہتا ہے

نہیں ہیں ترجمانِ غم، یہ آنسو
یہ پانی اب اُبلنا چاہتا ہے

گزشتہ صحبتوں کا ایک لشکر
مرے ہمراہ چلنا چاہتا ہے

ان آنکھوں کی ادا کتنی ہے امجد
کوئی پتھر پگھلنا چاہتا ہے



چھپڑیں گے وہی قصہ غم اور طرح سے
لائیں گے تجھے راہ پہ ہم اور طرح سے
سجدے میں جبیں، سینے میں پندارِ خدائی!
اب آئے ہیں کعبے میں صنم اور طرح سے
ہوتا ہے گماں ان پہ کسی دستِ طلب کا
اب کھولے ہیں یاروں نے علم اور طرح سے

ہے کام مساواتِ محمد کو مٹانا
کرتا ہے عرب اور، عجم اور طرح سے

کھلم سوچتے رہتے ہیں عطا اور طرح کی
دیتا ہے ترا دستِ کرم اور طرح سے

مرتے تو شہیدانِ محبت بھی ہیں انجمن
جاتے ہیں مگر سوئے عدم اور طرح سے

۷۷۷ لکھی

چہرے پہ مرے زلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گر جیتے ہو، برس جاؤ کسی دن

رازوں کی طرح اُتر دو مرے دل میں کسی شرب
دشک پہ مرے ہاتھ کی کھل جاؤ، کسی دن

پیڑوں کی طرح حُسن کی بارش میں نہاؤں
بادل کی طرح جھوم کے گھراؤ کسی دن

خوشبو کی طرح گزر و مرے دل کی گلی سے
 پھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن
 پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
 پھر لطفِ شب وصل کو دوہراؤ کسی دن
 گزریں جو مرے گھر سے توڑک جائیں ستارے
 اس طرح ہر رات کو چمکاؤ کسی دن
 میں اپنی ہر اک سانس اسی رات کو دے دوں
 سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ، کسی دن

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
 کہیں آنکھیں کہیں چہرہ نہیں ہے
 یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرتے!
 یہ میرے خواب ہیں رستہ نہیں ہے
 جہاں پر تھے ترمی پلکوں کے سائے
 وہاں اب کوئی بھی سایا نہیں ہے

زمانہ دیکھتا ہے ہر تماشہ
 یہ لوط کا کھیل سے تھکتا نہیں ہے

ہزاروں شہر ہیں ہمراہ اس کے
 مسافر دشت میں تنہا نہیں ہے

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جبتا نہیں ہے

جو دیکھو تو ہر اک جانب، سمندر
مگر پینے کو اک قطرہ نہیں ہے

مثال چوب نم خوردہ، یہ سینہ
سنگلتا ہے، مگر جلتا نہیں ہے

۱) خدا کی ہے یہی پہچان، شاید
کہ کوئی اور اُس جیسا نہیں ہے

۱) لہاں آکے رکنے تھے راتے! کہاں موڑ تھا! اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اُسے بھول جا

۲) وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر مری بات سن، اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

تو یہ کس لیے شب، بجر کے اُسے ہر ستارے میں دیکھتا
وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اُسے بھول جا

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، تے رے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بھول جا

میں تو گم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس تیرے گمان میں
صبا کہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، تے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا، تو بھی مسکرا، اُسے بھول جا

کہیں چاکِ جان کا رُفونہیں، کسی آستیں پہ لہو نہیں
کہ شہیدِ راہِ ملال کا نہیں خوں بہا، اُسے بھول جا

کیوں اٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا ترے بخت میں سو وہ ہو گیا، اُسے بھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگتا، اُسے بھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اُسے دیکھ، اس پہ یقین نہ کہ
نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سہ آئینہ، اُسے بھول جا

جو بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بولا، اُسے بھول جا

(جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھینگے تھے
 تم بھی اُس کو چھو کے گزنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا

(۱۰) ”خوابِ مسافر لحوں کھے ہیں ساتھ کہاں تک جائیں گے“
 تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

(۱۱) باہل اور ڈھ کے گزروں گا میں تیرے گھر کے آنگن سے
 توں فرج کے سب رنگوں میں تجھ کو بھینگا دیکھوں گا

(۱۲) رات گئے جب چاند تارے نکلن بیٹی کھیلے گے
 آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چھو لوں گا

(۱۳) بے موسم بارش کی صورت، دیر تک اور دور تک
 تیرے دیارِ حُسن پہ میں بھی رکن رکن برسوں گا

(۱۴) شرم سے دوہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی
 بادِ صبا کے لہجے میں اک بات میں ایسی پوچھوں گا

(۱۵) اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
 جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا

(۱۶) تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دیلیں پہ رکھنا
 میں بھی روز اک خواب تمہارے شہر کی جانب بھجوں گا

(۱۷) ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
 پانی کی ہر سطح پہ میں کچھ دل کی باتیں لکھوں گا



بانجھ ارادہ اور کوئی!
جھوٹا وعدہ اور کوئی!

ہم جیسا کیا دیکھا ہے!
تم نے سادہ اور کوئی!

دل میں سارا کھوٹ ہی کھوٹ
تن پہ لبادہ اور کوئی

دیر و حرم تو چھان لیے
دیکھیں جادہ، اور کوئی!

صفحہ صفحہ ایک کتاب حُسن سی کھلتی جائے گی
اور اُسی کی نو میں پھر میں تم کو ازبر کر لوں گا

وقت کے اک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آپ رواں میں کیسے امجداب وہ چہرہ جوڑوں گا

دل میں اب کیوں رہتا ہے!
تم سے زیادہ اور کوئی!

نکلے تھے ہم اپنے گھر سے
کر کے ارادہ اور کوئی

آخر کس اُمید پہ مانگیں
المحبد وعدہ اور کوئی!

شہد کہیں گے سُم کو بھی
جینا تو ہے ہم کو بھی!

تجھ بن جلتے دیکھا ہے
پھولوں کے موسم کو بھی

بازاروں میں لے آئے
لوگ تو دل کے عزم کو بھی!

مہلت آنکھ جھپکنے کی
منظر کو بھی، ہم کو بھی



وہ جو اوپر ہے بیٹھا ہوا، اور ہے

میری بستی کا شاید خدا، اور ہے!

وصل کی شب تو چمکے تھے تارے بہت

؛ حجب کی شام کا سلسلہ اور ہے

شہر میں جو اڑی وہ خبر، اور تھی

جس سے گزرے تھے ہم، واقعہ اور ہے

کر رہا ہوں مسلسل سفر کس لیے؟

اُس کی بستی کا تو راستہ اور ہے

صدیوں پیچھے بھاگے گا

ٹھہرا جو اک دم کو بھی

قاصد کر کے دیکھیں گے

اب کے چشمِ نم کو بھی

کون یہ پیسا گزرا ہے؟

توڑ کے حجامِ جم کو بھی

مولا — تیری دنیا میں

چین ملے گا ہم کو بھی!

امجد اُونچا رکھیں گے

جلے ہوئے پرچم کو بھی

خود کو لگتے ہیں کیوں ، اجنبی ، اجنبی !
عکس بدلا ہے یا آئینہ اور ہے

ماند پڑتے ہوئے منظرہوں کی قسم !
واپسی کے سفر کا مزا اور ہے

دردمند وفا ، کس طرح سے رُکے
اس نگر کی تو آب و ہوا اور ہے

اپنے تاروں سے کہنا ، چمکتے رہیں !
میری آنکھوں میں اک رتجگا اور ہے

اب تو ہے راکھ کی ایک مٹھی ، یہ دل
جو ہوا سے لڑا تھا دیا اور ہے !

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ، فرصت کتنی ہے
پھر بھی تیرے دیوانوں کی شہرت کتنی ہے !

سورج گھر سے نکل چکا تھا کہ نہیں تیسزیکے
شبنم گل سے پوچھ رہی تھی ” مہلت کتنی ہے !“

بے مقصد سب لوگ مسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سناٹے کی دہشت کتنی ہے !

لفظ تو سب کے اک جیسے ہیں ، کیسے بات کھلے ؟
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہرت کتنی ہے !

سپنے بیچنے آتو گئے ہو، لیکن دیکھ تو لو
دنیا کے بازار میں ان کی قیمت کتنی ہے!

دیکھ غزالِ رم خوردہ کی پھیلی آنکھوں میں
ہم کیسے بتلاؤں دل میں وحشت کتنی ہے!

ایک ادھورا وعدہ اُس کا، ایک شکستہ دل
لٹ بھی گئی تو شہرِ وفا کی دولت کتنی ہے!

میں ساحل ہوں اجدادِ وہ دریا جیسا ہے
کتنی دُوری ہے دونوں میں، قربت کتنی ہے!

شمع غزل کی لو بن جاٹے، ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اک اک حرف میں سوچ کی خوشبو، دل کا اُجالا ہو تو کہو

رازِ محبت کہنے والے لوگ تو لاکھوں ملتے ہیں
رازِ محبت رکھنے والا، ہم سادھیسا ہو تو کہو!

کون گواہی دے گا اٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں بارا ہو تو کہو!

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا، عثم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

انجذ صاحب آپ نے بھی تو دنیا گھوم کے دیکھی ہے
ایسی آنکھیں ہیں تو بناؤ! ایسا چہرہ ہو تو کہو!



حضورِ یار میں حرفِ اتجا کے رکھے تھے
چراغِ سامنے جیسے ہوا کے رکھے تھے

بس ایک اشکِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اٹھا کے رکھے تھے

سومِ وقت نے لہجے کو زخمِ زخم کیا
وگر نہ ہم نے قرینے صبا کے رکھے تھے

ہمھی نے پاؤں نہ رکھا وگر نہ وصل کی شب
نہیں پہ ہم نے تارے بچھا کے رکھے تھے!

بکھر رہے تھے سوہم نے اٹھایے خود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے

ہوا کے پہلے ہی جھونکے سے ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

مٹا سکی نہ انھیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے

حصولِ منزلِ دُنیا کچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتھر اُنا کے رکھے تھے!

اگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جولا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا!

دروازوں پر پڑے ہوئے تھے ٹھہرے خوابوں کے
دالانوں میں نفرت کے آئینے نے ڈیرا ڈالا تھا

گلیوں گلیوں بھٹک رہا تھا ایک نہرا خواب جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں بیندیں بیچ کے پالا تھا

✓ اپنی اپنی کشتی لے کر یوں دریا میں کود پڑے
جیسے صرف جہاز ہی اس طوفان میں ڈوبنے والا تھا

✓ اجمد یہ نصیر تھی اُس کی یا قدرت کا کھیل!
گر جہاں پر رات کا پنچھی، تھوڑی دُور اُجالا تھا

۵۰) بھیڑ میں اک اجنبی کا سامن اچھا لگا

سب سے چُھپ کر وہ کسی کا دیکھنا اچھا لگا

۵۱) سُرمئی آنکھوں کے نیچے پھول سے کھلنے لگے

کہتے کہتے کچھ کسی کا سوچنا، اچھا لگا

۵۲) بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم

ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکتا اچھا لگا

۵۳) چائے میں چینی ملانا اُس گھڑی بھایا بہت

زیر لب وہ مسکراتا "شکر یہ" اچھا لگا

دل میں رکتے عہد باندھے تھے بھلاز کے اُسے
وہ ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی پیاری لگی
کم تو حبت آنکھ کا وہ دیکھنا اچھا لگا

نیم شب کی خاموشی میں بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جلو میں گھومنا اچھا لگا

اُس عُدوتے جاں کو امجد میں بُرا کیسے کہوں!
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا، اچھا لگا

ایک آزار ہوئی جاتی ہے شہرت ہم کو
خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت ہم کو

روشنی کا یہ مُسافر ہے رہ جاں کا نہیں!
اپنے سائے سے بھی ہونے لگی وحشت ہم کو

آنکھ اب کس سے تجھ پر کا تماشہ مانگے!
اپنے ہونے پہ بھی ہوتی نہیں حیرت ہم کو!

اب کے اُمید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی مجھ سے ہم کو



شہر اُجڑا ہو تو آباد کروں! ✓
جو نہ بھولے اُسے کیا یاد کروں!

ساری چیزیں ہی بدل کر رہ جائیں
اک ہنر ایسا بھی ایجاد کروں

(میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو ترے بعد کروں) ✓

بھیک لعنت ہے! ملے یا نہ ملے
کیوں میں رُسوائی نہ یاد کروں!

کون سی رُت ہے زمانے میں، ہمیں کیا معلوم
اپنے دامن میں لیے پھرتی ہے حسرت ہم کو

زخم یہ وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ بھرے
ہجر میں ایسی ملی اب کے مسافت ہم کو

دُرخِ عصیاں تو کسی طور نہ چھپتے اُجڑے ✓
ڈھانپ لیتی نہ اگر چادرِ رحمت ہم کو

کوئی اُس آنکھ پہ شاید اترے!
روزِ اک خواب کو آزاد کروں

یہ تو ہے کھیل کا حصّہِ امجد
کس لیے شکوہ بے داد کروں

جو اتر کے زینہٴ شام سے تری چشمِ خوش میں سما گئے
وہی جلتے بجھتے چراغ سے مرے بام و در کو سجا گئے

یہ جو عاشقی کا ہے سلسلہ ہے یہ اصل میں کوئی معجزہ
کہ جو لفظ میرے گمناں میں تھے، وہ تری زبان پہ آ گئے!

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں، مری عمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں، جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

وہ چراغِ جاں کبھی جس کی تو، نہ کسی ہوا سے نہ گوں ہوئی
تری بے وفائی کے سوسے اُسے چپکے چپکے بچھا گئے

شکستہ لاکھ ہو نیا کسی کی
نہیں سنتا مگر دریا کسی کی

ضروری کیوں ہے زخم بے دفائی
گزرتی کیوں نہیں، تنہا کسی کی!

کسی کے ساتھ سایا تک نہیں ہے
کسی کے ساتھ ہے دنیا کسی کی

وہ تھا چاندِ شامِ وصال کا، کہ تھا روپِ تیرے جسمِ مال کا
میری روح سے ہری آنکھ تک، کسی روشنی میں نہا گئے!

یہ جو بندرگانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی لشکری!
جنہیں زندگی نے اماں نہ دی، تو ترے حضور میں آ گئے

ترمی بے رخی کے دیارِ نین میں ہوا کے ساتھ ہوا، ہوا
ترے آٹنے کی تلاش میں، مرے خواب چہرا گنوا گئے

ترے دوسو سوں کے فشار میں، ترا شہرِ رنگِ اُجڑ گیا
میری خواہشوں کے غبار میں، مرے ماہ و سالِ وفا گئے!

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے، ترے ہونٹ جن سے نہک اُٹھے
مرے دشتِ خواب میں دُور تک، کوئی باغ جیسے لگا گئے

میری عمر سے نہ سمٹ سکے، مرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس بٹنہِ خواب تھے، ترمی اک نگاہ میں آ گئے

میں آنکھوں میں سجائے پھر رہا ہوں
نشانی ہے مرا صحرا کسی کی

پرانے ملکے کپڑوں میں امجد
بڑھی کچھ اور بھی شو بھب کسی کی



منشور

غبارِ درختِ طلب میں ہیں رفتگاں کیا کیا
چمک رہے ہیں اندھیرے میں استخوان کیا کیا

دکھا کے ہم کو ہمارا ہی فاشس فاش بدن
دلاسے دیتے ہیں دیکھو تو قاتلاں کیا کیا

گھٹی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگا
رہنے جو گھر تو ہو پیدا ہوئے مکاں کیا کیا

پلٹ کے دیکھا تو اپنے نشان پا بھی نہ تھے
ہمارے ساتھ سفر میں تھے ہم راں کیا کیا

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے اٹھے حساب داں کیا کیا

کسے خبر ہے کہ امجد بہار آنے تک
خزاں نے چاٹ لیے ہوں گے گلستاں کیا کیا

ہلاکِ نالہ تشنم، ذرا نظر تو اٹھا
نمود کرتے ہیں عالم میں گل رُخاں کیا کیا

کہیں ہے چاند سوالی، کہیں گدا خورشید
تمھارے در پر کھڑے ہیں یہ ساٹلاں کیا کیا

پچھڑ کے تجھ سے نہ جی پائے، مختصر یہ ہے
اس ایک بات سے نکلی ہے اتناں کیا کیا

ہے پرسکون سمندر مگر سنو تو سہی
لبِ خموش سے کہتے ہیں بادباں کیا کیا

کسی کا رختِ مسافت تمام دھوپ ہی دھوپ
کسی کے سر پہ کشیدہ ہیں سائباں کیا کیا

نکل ہی جائے گی اک دن مدر سے یہ زمیں
اگر چہ پہرے پہ بیٹھے ہیں آسماں کیا کیا

منزل کی بے رُخی کے گلہ مند تھے ہمیں
 ہر راستے میں سنگِ مجسم بھی ہم ہی تھے
 اپنی ہی آستیں میں تھا خنجر چھپا ہوا
 اعبد ہر ایک زخم کا مرہم بھی ہم ہی تھے



پسا ہوئی سپاہ تو پرچم بھی ہم ہی تھے
 حیرت کی بات یہ ہے کہ برہم بھی ہم ہی تھے
 گرنے لگے جو سوکھ کے پتے تو یہ کھلا!
 گلشن تھے ہم جو آپ تو موسم بھی ہم ہی تھے
 ہم ہی تھے تیرے وصل سے محرومِ عمر بھر
 لیکن تیرے جمال کے محرم بھی ہم ہی تھے

سیپ اور جوہری کے سب رشتے
شعر اور شعر کے ہنر میں ہیں

سایہ راحتِ شجر سے نکل
کچھ اڑائیں جو بال و پر میں ہیں؟

عکس بے نقش ہو گئے امجد
لوگ پھر آئینوں کے ڈر میں ہیں



کب سے ہم لوگ اس بھنور میں ہیں!
اپنے گھر میں ہیں یا سفر میں ہیں!

یوں تو اڑنے کو آسماں ہیں بہت
ہم ہی آشوبِ بال و پر میں ہیں

زندگی کے تمام تر رستے
موت ہی کے عظیم ڈر میں ہیں

اتنے خدشے نہیں ہیں رستوں میں
جس قدر خواہشِ سفر میں ہیں

پیرہن میں بھی ترا حُسن نہ تھا برق سے کم
جب کھلے بندِ قبا اور ہی نقشاً چمکا

رُوح کی آنکھیں چمکا چوند ہوتی جاتی ہیں
(کس کی آہٹ کا مرے کان میں نغمہ چمکا

رنگ آزاد ہوئے گل کی گرہ کھلتے ہی
ایک لمحے میں عجب باغ کا چہرا چمکا

دل کی دیوار پہ اڑتے رہے بلبوس کے رنگ
دیر تک ان میں تری یاد کا سیا چمکا

لہریں اٹھ اٹھ کے مگر اس کا بدن چومتی تھیں
وہ جو دریا پہ گیا خوب ہی دریا چمکا

یوں تو ہر رات چمکتے ہیں ستارے لیکن
وصل کی رات بہت صُبح کا تارا چمکا



(نذیر مصحفی)

جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا
چشم بے آب کی دہلیز پہ دریا چمکا

فصل گل آئی، کھلے باغ میں خوشبو کے علم
دل کے ساحل پہ ترے نام کا تارا چمکا

عکس بے نقش ہوئے آئنے دھندلانے لگے
درد کا چاند سرِ بامِ تمنا چمکا

ہجرت پنپا نہ ترا وصل ہمیں راس آیا
کسی میدان میں تارا نہ ہمارا چمکا

جیسے بارش سے ڈھلے صحن گلستاں امجد
آنکھ جب خشک ہوئی اور بھی پہرا چمکا



سائے ڈھلنے، چراغ جلنے لگے

لوگ اپنے گھروں کو چلنے لگے

اتنی پڑتیج ہے بھنور کی گرہ

جیسے نفرت دلوں میں پلنے لگے

دُور ہونے لگی جس کی صدا

کارواں، راستے بدلنے لگے

اُس کے لہجے میں برف تھی لیکن ✓

چھو کے دیکھا تو ہاتھ جھلنے لگے

راہ گم کردہ طائروں کی طرح
پھرتارے سفر پہ چلنے لگے

پھر نگاہوں سے کٹ گئیں آنکھیں
عکس پھر آئے بدنے لگے

اُس کے بندِ قبا کے جادو سے
سانپ سے انگلیوں میں چلنے لگے



پردے میں اُس بدن کے چھپیں راز کس طرح!
خوشبو نہ ہوگی پھول کی عنتا کس طرح!

طہر کلام اُن کا ہوا طہر خاص و عام
بدلیں گے اب وہ بات کا انداز کس طرح

بدلاجو اُس کی آنکھ کا انداز تو کھلا!
کرتے ہیں رنگ پھول سے پرواز کس طرح

(ق)

آنکھوں میں کیسے تن گئی دیوار بے جسی
سینوں میں گھٹ کے رہ گئی آواز کس طرح

وہ تھی پرست کیسے ہوئے مصلحت پرست؟
نغموں سے بے لباس ہوئے ساز کس طرح!

آنکھوں میں موم ڈال کے بیٹھیں گے کب تک
آئینوں سے چھپائیں گے یہ راز کس طرح!

اُس کی نظر میں عکس تعلق کہیں نہیں
امجد، حدیث شوق ہو آعنا کس طرح!

اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہوئے

ہم ہیں وہ بیدپ جو آزادہ گوہر نہ ہوئے

ترب بے صوت کی مانند رہے — دنیا میں

دشت امکان میں رکھلے نقش مصور نہ ہوئے

پھول کے رنگ سر شاخِ خزاں بھی چمکے

قیدی رسمِ چمن، خاک کے جوہر نہ ہوئے

شک کے گرتے بھی نہیں گھر کو پلٹتے بھی نہیں

نجمِ افلاک ہوئے، آس کے طائر نہ ہوئے

اس کی گلیوں میں رہے گردِ سفر کی صورت
 سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتھر نہ ہوئے
 اپنی ناکام اُمیدوں کے خم و پیچ میں گم
 ابرِ کم آب تھے ہم، رزقِ سمندر نہ ہوئے



اُوکے پھول سر شاخ انتظار کھلے
 یہ کس بہار کے نغنے، پس بہار کھلے!

دلوں سے گردِ مسافت دھلی تو آنکھوں میں
 گلِ وصال کھلے اور بے شمار کھلے

خود اپنے سامنے بے بس ہے قوتِ تخلیق
 کہ موجِ رنگ تو پتھر کے آریار کھلے

ہے جو بھی پھول وہ فرد حساب جیسا ہے
گئی رتوں میں جو بوئے تھے اب کی بار رکھلے

ہوا کچھ ایسی چلی ہے سو دہجہ میں
خزاں کے صحن میں جیسے گل بہار رکھلے



لو میں تیرتے پھرتے ملال سے کچھ ہیں
کبھی سُنو تو دلوں میں سوال سے کچھ ہیں

میں خود بھی ڈوب رہا ہوں ہر اک تارے میں
کہ یہ چراغِ مرے حسرتِ حال سے کچھ ہیں

غمِ فراق سے اک پلِ نظر نہیں ٹپتی
اس آئینے میں تم سے خدوِ حال سے کچھ ہیں

اک اور موج کہ اے سیلِ اشتباہِ ابھی
ہماری کشتِ یقیں میں خیال سے کچھ ہیں

ترے فراق کی صدیاں تیرے وصال کے پل
شمارِ عمر میں یہ ماہ و سال سے کچھ ہیں

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارا تھا
ساحل کی اُس بھٹی میں جانے کون ہمارا تھا!

کساؤں کی گونج کی صورت بھیل گیا ہے وہ
میں نے اپنے آپ میں چھپ کر جسے پکارا تھا

سر سے گزرتی ہر اک موج کو ایسے دیکھتے ہیں
جیسے اس گردابِ فنا میں ہی سہارا تھا!

ہجر کی شربِ نیلی آنکھیں اور بھنبی سی تھیں
جیسے اُس نے اپنے سر سے بوجھ اتارا تھا

جس کی چھلمتا میں تم نے، مجھ کو قتل کیا
پت جھڑکی اُس رات وہ سبے روشن تارا تھا

ترکِ وفا کے بعد ملا تو، جب معلوم ہوا
اس میں کتنے رنگ تھے اس کے، کون ہمارا تھا

کون کہاں پر جھوٹا نکٹا! کیا بتلاتے ہم
دُنیا کی تفریح تھی اس میں، ہمیں خسار تھا

جو منزل بھی راہ میں آئی، دل کا بوجھ بنی
وہ اُس کی تعبیر نہ تھی جو خواب ہمارا تھا

یہ کیسی آواز ہے جس کی زندہ گونج ہوں میں
صبح ازل میں کس نے امجد مجھے پکارا تھا

تارا تارا اتر رہی ہے رات سمندر میں
جیسے ڈوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہونگے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اُس نے، آگے یا نہیں
کھُل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لوٹ آیا تھا، کشتی چلنے پر
پگھل چکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہوں ایسے اعباد یہ ہستی کی رہ
بے پیواری ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں



لرزش ننگہ میں، لہجے میں لگنت عجیب تھی
اس اولیں وصال کی وحشت عجیب تھی

روشن ہوئی اسی سے، اسی سے بکھر گئی
شبِ بنم کو آفتاب سے نسبت عجیب تھی

آنسو دیکھنے پر آنکھ کو رونے کی خونہ دی
اے بادشاہِ غم، یہ عنایت عجیب تھی

کھڑکی میں آکے چاند نے جھپکی نہیں پلک
کل شربِ مرے مکان میں صحبت عجیب تھی

اِک پل تو جیسے سارا بدن سنسنا اٹھا
اِس سرسری نگاہ میں دعوتِ عجیب تھی

ساحل پہ تھے تو ریت کا جادو تھا ہر طرف
کشتی چلی تو سحر کی دہشتِ عجیب تھی

دل میں نہ رہ سکے، جو کہیں تو کمی نہ جائے
محبِ شکستِ دل کی حکایتِ عجیب تھی

دشتِ دل میں سرابِ تازہ ہیں
بُجھ چکی آنکھ، خوابِ تازہ ہیں

داستانِ شکستِ دل ہے وہی
ایک دو چار بابِ تازہ ہیں

کوئی موسم ہو دلِ گلستان میں
آرزو کے گلابِ تازہ ہیں

دوستی کی زباں ہوتی متروک
نفرتوں کے نصابِ تازہ ہیں



جو سردار آ نہیں سکتا
قرض ہستی چکا نہیں سکتا

” آج “ جس آئینے میں ڈھنڈلا ہو
عکس کل کا دکھا نہیں سکتا
(ق)

لہر ایسی چلی ہے بستی میں
کوئی بھی سر اٹھا نہیں سکتا

ضبط سے یوں چٹخ رہے ہونٹ
آدمی مسکرا نہیں سکتا

آگہی کے ، ہماری آنکھوں پر
جس قدر ہیں عذاب ، تازہ ہیں

زخیم در زخم دل کے کھاتے ہیں
دوستوں کے حساب تازہ ہیں

سر پہ بوڑھی زین کے امجد
آب کے یہ آفتاب تازہ ہیں

زخم بے عرصتی کی کیفیت
کوئی ہونٹوں پہ لا نہیں سکتا

اتنی گہری ہوئی ہے تاریکی
آدمی راہ پا نہیں سکتا

رات کے اس حصار میں میں تو
صبح کے گیت گا نہیں سکتا

کس قدر خواب ہیں نگاہوں میں
جن کو لفظوں میں لا نہیں سکتا

تم نہ دیکھو تمہارا دین ایمان
میں تو نظریں چرا نہیں سکتا

دل سمندر بھی ہو اگر امجد
پیاس غم کی بجھا نہیں سکتا

○
اُس نے آہستہ سے جب پکارا مجھے
جھک کے تنکے لگا ہر ستارے مجھے

تیرا غم، اس فشارِ شبِ روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

ہر ستارے کی بجھتی ہوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارہ مجھے

اے خدا، کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکارا مجھے



لہو میں رنگ لہرانے لگے ہیں
زمانے خود کو دہرانے لگے ہیں

پروں میں لے کے بے حاصل ادا نہیں
پرندے لوٹ کر آنے لگے ہیں

کہاں ہے قافلہ بادِ صبا کا
دلوں کے پھول مڑھانے لگے ہیں

کھلے جو ہم نشینوں کے گریباں
خود اپنے زخم افسانے لگے ہیں

کوئی سُورج نہیں، کوئی تارا نہیں
تُو نے کس جھپٹے میں اتارا مجھے!

عکسِ امروز میں، نقشِ دیروز میں
اک اشارہ تجھے، اک اشارہ مجھے

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لاکے مارا مجھے

چمن کی بارٹ تھی جن کا ٹھکانہ
دلِ شبنم کو دھڑکانے لگے ہیں

بچانے آئے تھے دیوار — لیکن
عمارت ہی کو اب ڈھانے لگے ہیں

خدا کا گھر تھی سمجھو، تو سمجھو
ہمیں تو یہ صنم خانے لگے ہیں

کچھ ایسا درد تھا بانگِ جرس میں
سفر سے قبل بچھتانے لگے ہیں

کچھ ایسی بے یقینی تھی فضا میں
جو اپنے تھے وہ بیگانے لگے ہیں

ہوا کا رنگ نیلا ہو رہا ہے
چمن میں سانپ لہرانے لگے ہیں

فلک کے کھیت میں کھلتے ستارے
زمیں پر آگ برسانے لگے ہیں

لب زنجیر ہے تعبیر جن کی
وہ پسینے پھر نظر آنے لگے ہیں

کھلا ہے رات کا تاریک جنگل
اور اندھے راہ دکھلانے لگے ہیں

میں اُس کی انجمن میں تھا اکیلا
کسی نے بھی مجھے دیکھا نہیں تھا

سحر کے وقت کیسے چھوڑ جانا!
تمھاری یاد تھی، سہنا نہیں تھا

کھڑی تھی رات کھڑکی کے سر ہانے
درتپے میں وہ چاند اتر نہیں تھا

دلوں میں گرنے والے اشک چھتا
کہیں اک جوہری ایسا نہیں تھا

کچھ ایسی ڈھوپ تھی اُن کے سروں پر
خدا جیسے غریبوں کا، تہیں تھا

ابھی حرفوں میں رنگ آتے کہاں!
ابھی میں نے اُسے لکھا نہیں تھا



اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

کچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں!
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

تمھیں نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

تھی پوری شکل اُس کی یاد مجھ کو
مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا

برہنہ خواب تھے سُوج کے نیچے
کسی اُمید کا پردا نہیں تھا

۷ ہے اجداد تک وہ شخص دل میں
کہ جو اُس وقت بھی میرا نہیں تھا



۱ جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دُنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کت ابوں میں نہیں رہتے

بہار آئے تو ہر اک چھول پر اک ساتھ آتی ہے
ہوا جن کا مقدر ہو وہ شِخوں میں نہیں رہتے

لیے پھرتے ہیں کچھ احباب ایسے مضطرب سجدے
جہاں دربار مل جائے جبینوں میں نہیں رہتے

مہک اور تکیوں کا نام بھونرے سے جدا کیوں ہے
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پہ پھولوں میں نہیں رہتے



کبھی تو دل تمناؤں کے اس گرداب سے نکلے

ہنر بھی کچھ ہمارے دیدہ بے خواب سے نکلے!

ستارے ٹوٹ کر جیسے خلاؤں میں بکھر جائیں!

ہمارے نام بھی ایسے دل احباب سے نکلے

چمن میں گل بکھرنے پر بھی خوشبو چھوڑ جاتے ہیں!

زمین کی انجمن سے جو اٹھے آداب سے نکلے

ابھی تک ان کے بام و در پر امیدیں لرزتی ہیں

یہ کن شہروں کے نقشے وادی سیلاب سے نکلے

مجت کا سخن وہ ہے کہ دشتِ ننگ میں کیجے
تو اس کی بازگشتِ عشمِ دلِ مہتاب سے نکلے

نہ ٹھہرا ایک بھی امجدِ مری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کارواں اس رگزارِ آب سے نکلے



کبھی رقصِ شام بہار میں اُسے دیکھتے
کبھی خواہشوں کے غبار میں اُسے دیکھتے

مگر ایک نجمِ سحر نما، کہیں جاگتا،
ترے ہجر کی شبِ تار میں اُسے دیکھتے

وہ تھا ایک عکسِ گریزِ پنا، سو نہیں رُکا
کئی عُمردشتِ و دیار میں اُسے دیکھتے

وہ جو بزم میں رہا بے خمبہ، کوئی اور تھا
شبِ وصلِ میرے کنار میں اُسے دیکھتے

جو ازل کی لوح پہ نقش تھا، وہی عکس تھا
کبھی آپ قریب دار میں اُسے دیکھتے

وہ جو کائنات کا نور تھا، نہیں دور تھا
مگر اپنے قُرب و جوار میں اُسے دیکھتے

یہی اب جو ہے یہاں نعمتِ خوں، یہی خوش بیاں
کسی شام کوئے نگار میں اُسے دیکھتے



کسی کی آنکھ میں خود کو تلاش کرنا ہے
پھر اس کے بعد ہیہ، آنسوؤں سے ڈرنا ہے

فنا کی بندگی کے فقیر ہیں تارے!
کہ گھوم پھر کے یہیں سے انھیں گزنا ہے

☆ جو زندگی تھی مری جان! تیرے ساتھ گئی
بس اب تو عمر کے نقشے میں وقت بھرنا ہے

♣ جو تم چلو تو ابھی دوست دم میں کٹ جائے
جو فاصلہ مجھے صدیوں میں پار کرنا ہے

تو کیوں نہ آج یہیں پر قیام ہو جائے ✓
 کہ شب قریب ہے، آخر کہیں ٹھہرنا ہے

وہ میرا سیل طلب ہو کہ تیری رعنائی
 چڑھا ہے جو بھی سمندر اُسے اترنا ہے

سحر ہوئی تو ستاروں نے مُوند لیں سہکھیں ✓
 وہ کیا کریں کہ جنھیں انتظار کرنا ہے

یہ خواب ہے کہ حقیقت، خبر نہیں امجد
 مگر ہے جیسا ہیں پر، یہیں پر مرنا ہے

زندگانی، جب ودانی بھی نہیں
 لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

ہے سوا نیزے پہ سورج کا علم
 تیرے غم کی سائبانی بھی نہیں

منزلیں ہی منزلیں ہیں ہر طرف
 راستے کی اک نشانی بھی نہیں

آننے کی آنکھ میں اب کے برس
 کوئی عکس مہربانی بھی نہیں

آنکھ بھی اپنی سراب آلود ہے
اور اس دریا میں پانی بھی نہیں

جڑ تجیتر، گردبادِ زیت میں
کوئی منظر غیر فانی بھی نہیں

درد کو دلکش بنائیں کس طرح!
داستانِ غم، کہانی بھی نہیں

یوں لٹا ہے گلشنِ وہم و گمماں
کوئی حسرتِ بدگمانی بھی نہیں

زندگی درد بھی، دوا بھی تھی
ہم سفر بھی، گریز پا بھی تھی

کچھ تو تھے دوست بھی فاش
کچھ مری آنکھ میں جیا بھی تھی

دن کا اپنا بھی شور تھا لیکن
شب کی آواز بے صدا بھی تھی

عشق نے ہم کو غیب دان کیا
یہی تحفہ، یہی سزا بھی تھی

گرد بادِ وفا سے پہلے تک

سر پہ خیمہ بھی تھا ردا بھی تھی

✓ ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں

میرے ہمراہ وہ دُعا بھی تھی

کچھ تو تھی رگِ گز میں شمعِ طلب

اور کچھ تیسرہ وہ ہوا بھی تھی

یہ وفا تو وہ خیر تھا اجداد

کیلن اُس میں کہیں وفا بھی تھی!

○
آنکھوں سے اک خواب گزرنے والا ہے

کھڑکی سے مہتاب گزرنے والا ہے

صدیوں کے ان خواب گزیدہ شہروں سے

مہرِ عالم تاب گزرنے والا ہے

جادوگر کی قید میں تھے جب شہزادے

تقصے کا وہ باب گزرنے والا ہے

(ق)

سناٹے کی دہشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گزرنے والا ہے

دریاؤں میں ریت اُڑے گی صحرا کی
صحرا سے گردِ اب گزرنے والا ہے

مولا جانے کب دیکھیں گے، آنکھوں سے
جو موسمِ شاداب گزرنے والا ہے

ہستیِ امجد دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

سناٹوں میں



وہ بادِ شام تھا اُس کو گزرنے ہی جانا تھا
گلِ اُمید کھلا تھا، پھس رہی جانا تھا

زمین کا رزق ہوئے وصلِ انتظار کے رنگ
پس بہار یہ نقشہ اُتر ہی جانا تھا

ہراکِ سفر کی حدوں پر تھا ایک اور سفر
تھکرا ساتھ نہ ملتا تو مر ہی جانا تھا

وہ ایسے ناز سے گزرا کہ میں بلاناہ سکا
یہ اور بات مجھے بھی اُدھر ہی جانا تھا

سفر کی اولین شب میں گریز کر جاتا
اُسے یہ ہاتھ اگر چھوڑ کر ہی جانا تھا

دُفا کے باب میں نفظوں کے سلسلے تھے بہت
کہیں کسی کو مری جاں، نکر ہی جانا تھا

سُفق کے ہاتھ پہ تاروں کا خون تھا امجد
میں کو رچشم اُسے بھی سحر ہی جانا تھا

۱۹۴۴ء



(نذرِ اقبال)

ہجومِ صید میں دیکھا گھرا ہوا صیتِ د
بدل رہا ہے نیا رُوپِ عالمِ ایجاد

تمھاری میری مجتہت بحال کیسے ہو!
تغییرات پہ قائم ہے وقت کی بنیاد

جب اپنی آنکھ کا دیکھا نہ معتبر ٹھہرے
کہاں سے لائیں خیالوں کے واسطے اُسناد

وہ کیا گھڑی تھی کہاں پر ملے تھے ہم دونوں
وہ چل دیا تو مجھے دیر تک نہ آیا یاد



کنے کو میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں
 امجد رگروہ شخص مجھے جھوٹا نہیں

ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
 میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں

آشفگی سے اُس کی اُسے بے وفانہ جان
 عادت کی بات اور ہے دل کا بُرا نہیں

صاحبِ نظر سے کرتا ہے پتھر بھی گفتگو
 ناخس کے حضور زباں کھولت نہیں

مرا بدن تھا گھنے جنگلوں کی تاریکی
 ترمی طلب نے کیا ہے یہ خاکداں آباد

میں اپنے ہمت کی تنہائیوں میں رہتا ہوں
 یہ مُسکراتا ہوا شخص ہے مرا ہمراز

جو بستیاں تھیں اُنھیں تو مٹا چکے امجد
 نجانے اب یہ خرابے کرے گا کون آباد!

۱۹۷۷ء

کلا تنہا اُداس چاند کو سمجھو نہ بے خبر
ہر بات سُن رہا ہے مگر بولتا نہیں

خاموش رنجگوں کا دُھواں تھا چہار سُو
نُکلا کب آفتاب مجھے تو پتا نہیں!

امجد وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر
اُن میں کوئی بھی عکس مرے نام کا نہیں

۱۹۶۶ء

نعرہ نہیں تو نالہ ہی کوئی بلند ہو
اے ساکن ان شہرِ ستمگار کچھ کو

کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تار بے حسی
کرتے ہو بند کس طرح سُوج کی آنکھ کو!

سہمے ہوئے ہیں اپنی ہی خاتھیوں سے لوگ ✓
مردہ نہیں یہ شہر مگر تم صدا تو دو!

کیوں ہاتھ باندھے بیٹھے رہو مجرموں کی مثل
دستِ ستم شعار سے تلوار چھین لو

امجدیہ رت بجگے ہیں سزا خواہِ مست کی
تاروں کے سائبان تلے جاگتے رہو



کسی کی آنکھ جو پرِ غم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو غم نہیں ہے

۱۹۶۶ء

سوادِ درد میں تنہا کھڑا ہوں!
پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی!
اگر چیخِ گفتگو مُبہم نہیں ہے

سُنکتا کیوں نہیں تاریک جنگل!
طلب کی لو اگر تڑپ نہیں ہے

یہ بستی ہے ستم پروردگاہ کی
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

کنارا دُورا دریا کا جیسے
وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا
وجود تیرگی محکم نہیں ہے

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

جو کوئی سن سکے اے تُو دُنیا
بجز اک بازگشتِ غم نہیں ہے

۱۹۶۶ء



تلاشِ منزلِ جاناں تو اک بہانہ تھا

تمام عمر میں اپنی طرف روانہ تھا

میں تیری دُھن میں رواں تھا مجھے پتہ نہ چلا

غبارِ راہ میں شاملِ غم زمانہ تھا

اے میرا اُس کو حشر میں کس نام سے صدا دیتا

کہ میرا اُس کا تعارف تو غائبانہ تھا

عجب کشتِ تھی ہمندر کی سبز آنکھوں میں

ہر ایک چشمہ اُسی کی طرف روانہ تھا

وہی نہیں تو ورق کس لیے سیاہ کریں
 سخن تو عرضِ تمنا کا اک بہانہ تھا
 سمنہ شوق تھا اجد رواں دواں جب تک
 قدم کے نیچے ستاروں کا شاہیانہ تھا

۱۹۴۴ء



بستیوں میں اک صدائے بے صدارہ جائے گی
 بام و در پہ نقشِ تحریر ہوا رہ جائے گی
 آنسوؤں کا برزق ہوں گی بنے تیجہ چاہتیں
 خشک ہونٹوں پر لرزتی اک دُعا رہ جائے گی
 رُو برو منظر نہ ہوں تو آئے کس کام کے
 ہم نہیں ہوں گے تو دنیا گر دپارہ جائے گی

خواب کے نشے میں جھکتی جائے گی چشمِ قمر
رات کی آنکھوں میں پھیلی التجارہ جائے گی

بے ثمر پیڑوں کو چومیں گے صبا کے بزل لب
دیکھ لینا، یہ خزاں بے دست و پارہ جائے گی!



۱۹۷۶ء

تم سے بچھڑ کر پہروں سوچتا رہتا ہوں
اب میں کیوں اور کس کی خاطر زندہ ہوں
آئے خاموش خلا کے مالک تیری قسم
بزم جہاں میں تجھ سے زیادہ تنہا ہوں
جیتی جاگتی دنیا کے ہنگاموں میں
یوں لگتا ہے جیسے میں اک سایا ہوں
کھویا ہے وہ جیسے ہاتھ لکیر میں
ایسے اپنے ہاتھ کو تکتا رہتا ہوں

✓ ریزہ ریزہ ٹوٹ چکا ہوں اندر سے
 گھر سے باہر گردن تان کے چلتا ہوں
 جانے جس کا نام ہے امجد، کون ہے وہ
 سچ پوچھو تو میں اک جھوٹا چہرہ ہوں



۱۹۶۶ء

ردل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
 اتنا بے سمت نہ چل، ٹوٹ کے گھر جانا ہے
 اس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہرتی ہے
 جیسے پانا ہی اسے اصل میں مر جانا ہے
 ربول اے شامِ سفر، رنگ ہائی کیا ہے،
 دل کوڑکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے!
 کون ابھرتے ہوئے مہتاب کا رستہ روکے
 اس کو ہر طور سوئے و شب سحر جانا ہے

سایس کھلا ہوں تو اسی خاک میں ملتا ہے مجھے
 وہ تو خوشبو ہے اے گلے نگر جانا ہے
 وہ ترے حُسن کا جادو ہو کہ میرا غم دل
 ہر مسافر کو کسی گھاٹ اتر جانا ہے



دل میں لاوا اُبل رہا ہے کیا؟
 کوئی کہسار حبل رہا ہے کیا؟

۱۹۷۵ء

خوابِ فردا از میں پہ ظاہر ہو
 میری آنکھوں میں پل رہا ہے کیا؟

چشمِ شبنم — سفیرِ غنچہ بن
 یوں ہوا بن کے چل رہا ہے کیا؟

آتشِ یکِ غمِ خدائی ہو
 اپنی وحدت میں گل رہا ہے کیا؟

اتنے آسودہ کیوں ہیں اہل سفر
سر سے طوفان ٹل رہا ہے کیا؟

کس لیے بدحواس ہیں تارے
کوئی سُورج نکل رہا ہے کیا؟

کیوں ہو اس قدر رُکی سی ہے
کوئی طوفان پل رہا ہے کیا؟

کاٹ کر پھینک دے انھیں امجد
ایسے ہاتھوں کو بل رہا ہے کیا!

۱۹۷۵ء

اب کے سفر ہی اور تھا، اور ہی کچھ سراب تھے
دشمتِ طلب میں جا بجا، سنگِ گرانِ خواب تھے

حشر کے دن کا غلغلہ، شہر کے بامِ در میں تھا
زنگلے ہوئے سوال تھے، اگلے ہوئے جواب تھے

اب کے برس بہار کی، رُت بھی تھی انتظار کی
لجوں میں سیلِ درد تھا، آنکھوں میں اضطراب تھے

خوابوں کے چاند ٹھہل گئے تاروں کے دم نکل گئے
پھولوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے!

ابر برس کے کھل گئے، جی کے غبار دھل گئے
آنکھ میں رونا ہونے، شہر جو زیر آب تھے

درد کی رگزار میں، چلتے تو کس خماری میں
چشم کہ بے نگاہ تھی، ہونٹ کہ بے خطاب تھے

۱۹۶۵ء

سیل کی رگہز ہونے، ہونٹ نہ پھر بھی تر ہونے
کیسی عجیب پیاس تھی، کیسے عجب سحاب تھے!

عمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہو گئی
جسم تھا اور غدا تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

صبح ہوئی تو شہر کے شور میں یوں بکھر گئے
جیسے وہ آدمی نہ تھے، نقش و نگار آب تھے

آنکھوں میں خون بھر گئے، رستوں میں ہی بکھر گئے
آنے سے قبل مر گئے، ایسے بھی انقلاب تھے

ساتھ وہ ایک رات کا، چشمِ زدن کی بات تھا
پھر نہ وہ التفات تھا، پھر نہ وہ اجتناب تھے

ربط کی بات اور ہے، ضبط کی بات اور ہے
یہ جو فشارِ خاک ہے، اس میں کبھی گلاب تھے

تمام رنگ اُڑے جا رہے تھے اُس کی طرف
عجب طرح کی کشش آفتابِ شام میں تھی

چمک رہا تھا ہواؤں کی آستیں پہ لہو،
ادھر زمین بہاروں کے ہستام میں تھی

یہ کس نے لوٹ لیے قافلے ساروں کے
سحر کی تیغ تو اُمحبد ابھی نیام میں تھی

۱۹۷۵ء



ثریبِ فراق کی خوشبو غروبِ شام میں تھی
زمینِ دنگ، ستاروں کے ازدحام میں تھی

ہمیں خود اپنے تجس سے ہیں گلے کیا کیا
وہ بات اُس میں نہیں تھی جو اُس کے نام میں تھی

تجھے تلاشِ بنا جیسے اُفق کو چھونا تھا!
وہی سفر میں تھی حالت کہ جو قیام میں تھی

نگاہِ حنا ص جو ہوتی تو دیکھت کوئی
وہ ایک بات جو تیری نگاہِ عام میں تھی

جیسے سچ مُچ اُسے بہتِ نعم ہو

اس طرح اُس نے حال پوچھا ہے

اس قدر مہربان ہے دُنیا

زندہ رہنا عذاب لگتا ہے

(تم نے اچھٹا کیا جو لوٹ آئے
بارشوں کے سفر میں خطرہ ہے

(ق)

اس قدر قرض ہے محبت کا

سوچتا ہوں تو ہول اٹھتا ہے

عشق کے واجبات کیسے دوں!

تم نے کیا میرے پاس چھوڑا ہے



کس قدر زخمِ زخمِ چہرا ہے
چاند بھی آدمی سا لگتا ہے

اس کے دل میں بھی چور ہے شاید!
وہ بھی نظریں جھکا کے گُزا ہے

اس طرف میں ہوں اُس طرف تم ہو
بیچ میں زندگی کا میلا ہے

زر کی اس لٹ ہو گئی ہے بہت
ہر گھڑی دل کا بھوگا کرتا ہے

(ق)

اتنے مصروف ہو گئے ہیں ہم
وقت ٹھہرا ہوا سا لگتا ہے

آرزو، ماورائے وقت نہیں
مل بھی جاؤ اگر، تو اب کیا ہے!

کٹ کے نخلِ فناک سے اے امجد
تارا کھلتا ہے یا بکھرتا ہے؟

۱۹۷۵ء

گزر گیا جو زمانہ اُسے بھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا اُسے مٹا ہی دو
کھلے گا ترکِ تعلق کے بعد باپِ فنا
یہ ایک آخری پردہ بھی اب اٹھا ہی دو
رُکی رُکی سی ہوا ہے تھکا تھکا ہے چاند
وفا کے دشت میں حیراں کھڑے ہیں رہی دو
گزر رہا ہے جو لمحہ اسے امر کر لیں
میں اپنے خون سے لکھتا ہوں، تم گواہی دو

کسی طرح سے تفاعل کا باب شک تو کھلے
 نہیں میں پیار کے قابل تو کچھ سزا ہی دو
 سکا میں کائنات کو غم سے نجات دے دوں گی
 مری گرفت میں اک دن اگر تب ہی دو



رواں دواں ہے سفر، پیش و پس نہیں معلوم
 قفس میں رہتے ہیں، حد قفس نہیں معلوم

۱۹۶۴ء

* ملوں تو تا بہ ابد اس کو چومنا چاہوں
 کہاں بچھڑتے ہیں عشق و ہوس، نہیں معلوم

سکوتِ شام میں زنجیر سی چھنکتی ہے
 یہ سانس ہے کہ صدائے جس، نہیں معلوم

نشاطِ وصل کا لمحہ عجیب لمحہ تھا
 کہاں رہا ہوں میں اتنے برس، نہیں معلوم

زبیں کی قید میں میں ہوں یہ میری قید میں ہے
کہاں پہ گھر ہے کہاں ہے نفس، نہیں معلوم!

زبیں کے رنگ تھے جتنے، فنا پذیر ہوئے
جلی ہے کس لیے شمعِ نفس، نہیں معلوم

ٹپک رہا ہے سماعت میں کچھ نہ کچھ اُجڑ
نغمِ حیات کا سُم ہے کہ رس، نہیں معلوم

۶۱۹۷۴

وہی ہے درد کا عالم اُسے بھلا کر بھی
مرے قریب ہی نکلا وہ دُور جا کر بھی

پیئے ہیں سات سمندر مگر وہی ہے پیاس
نگاہ بھرتی نہیں ہے کسی کو پا کر بھی

انگ انگ سہی دُنیا کا اور دست کا غم
کبھی یونہی ذرا دیکھو انھیں بلا کر بھی

عجیب قحط پڑا اب کے سال اشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہوئی خون میں نہا کر بھی

ہر ایک شے تری رحمت کی گت گاتی ہے
اگر ہے سچ تو کبھی اے مرے خدا، کر بھی

فنا کا عکس ہے شبنم میں، گل کا عکس نہیں
بنگاہ کر کبھی اس آئنے میں آ کر بھی

زمین کا سانس رکا ہے ترے اُتارے پر
کبھی تو دیکھ ادھر اک نظر اٹھا کر بھی

بگولے رقص کو اٹھے ہوانے تالی دی
سکون مل نہ سکا بستنیوں سے جا کر بھی

ہر ایک قید کی کوئی اخیر ہے امجد
نفس کو خاک کے جادو سے اب رہا، کر بھی!

۱۹۷۴ء



رتوں کے ساتھ دلوں کی وہ حالتیں بھی گئیں
ہوا کے سنگ ہوا کی امانتیں بھی گئیں

✓ ترے کہے ہوئے نفظوں کی راکھ کیا چھپیں
ہمارے اپنے قلم کی صداقتیں بھی گئیں

✓ جو آئے جی میں پکارو مجھے، مگر ہے یوں
کہ اُس کے ساتھ ہی اُس کی محبتیں بھی گئیں

ک عجیب موڑ پہ ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے وختیں بھی گئیں

یہ کیسی نیند میں ڈوبے ہیں آدمی احمد
کہ ہار تھک کے گھروں قیامتیں بھی گئیں



چپکے چپکے ہی اثر کرتا ہے
عشق کینسر کی طرح بڑھتا ہے

رات کے پچھلے پہناروں میں
ایک ہنگامہ مچا رہتا ہے

گھر سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح
دل سرِ شہرِ وفا تنہا ہے

خواب میں جس سے پریشان تھے ہم
آنکھ کھولی تو وہی نقشہ ہے



نہ آسماں سے نہ دشمن کے زور و زور سے ہوا
 یہ معجزہ تو مرے دستِ بے ہنر سے ہوا
 قدم اٹھا ہے تو پاؤں تلے زمیں ہی نہیں
 سفر کا رنج ہمیں خواہش سفر سے ہوا
 میں بھیگ بھیگ گیا آرزو کی بارش میں
 وہ عکس عکس میں تقسیم چشم تر سے ہوا
 سیاہی شرب کی نہ چہروں پہ آگئی ہو کہیں
 سحر کا خوف ہمیں آنسوؤں کے ڈر سے ہوا

ق
 کون سُنتا ہے کسی کی پیت
 سب کے ماتھوں پہ یہی قصہ ہے

کوئی ڈرتا ہے بھری محفل میں
 کوئی تنہائی میں ہنس پڑتا ہے

یہی جنت ہے یہی ہے دوزخ
 اور دیکھو تو یہی دُنیا ہے

سب کی قسمت میں فنا ہے جب تک
 آسمانوں پہ کوئی زندہ ہے

وہ خُدا ہے تو زمیں پر آئے
 حشر کا دن تو یہاں برپا ہے

سانس روکے ہوئے بیٹھو امجد
 وقت دشمن کی طرح چلتا ہے

کوئی چلے تو زمیں ساتھ ساتھ چلتی ہے
یہ راز ہم پہ عمیاں گردِ رگزر سے ہوا

بچے بدن کی ہلک ہی نہ تھی تو کیا رکتے
گزر ہمارا کئی باریوں تو گھر سے ہوا

کہاں پہ سوئے تھے اجمد کہاں کھلیں آنکھیں
گماں قفس کا ہمیں اپنے بام و در سے ہوا



کجو دوست ہی نہ رہا، اُس سے اب گلہ کیا ہے!
مرے خدا! یہ مجت کا سلسلہ کیا ہے!
چلو تو سیل کی صورت نظر جھکا کے چلو
بلند و پست جو دیکھے وہ حوصلہ کیا ہے!
صدائے نکبتِ غنچہ! کہیں قیام تو کر
پتہ چلے تو سہی کچھ معاملہ کیا ہے!

۶۱۹۶۲

کرن کرن اُسے ڈھونڈنا، صدف صدف دیکھا
اگر ہے سعیِ مسلسل کا کچھ صلہ کیا ہے؟

وہ شخص جا بھی چکا ہے، ہمارا ہو بھی چکی
مگر یہ پھول سرِ شاخِ دل، کھلا کیا ہے!



(سانسوں میں اشتعال سا آیا ہوا تو ہے
موسمِ شبِ دصال سا آیا ہوا تو ہے
بیٹھے بٹھائے سُرخ ہونے کاں کس لیے!
دل میں کوئی خیال سا آیا ہوا تو ہے
لکھتے ہیں آستین ہوا پر کہانیاں
ہاتھوں میں یہ کمال سا آیا ہوا تو ہے
کانچِ بلند بام کو شاید خبر نہیں
بنیاد میں زوال سا آیا ہوا تو ہے

۱۹۷۴ء

ڈرتا ہوں آسمان کا جادو نہ ٹوٹ جائے
 لب تک کوئی سوال سا آیا ہوا تو ہے
 امجد جدائیوں کی یہ تمہید تو نہیں
 لہجوں میں پھر ملال سا آیا ہوا تو ہے



نکل کے حلقہ شام و سحر سے جائیں کہیں
 زمیں کے ساتھ نہ مل جائیں یہ حنائیں کہیں!
 سفر کی رات ہے پچھلی کہا نیاں نہ کہو!
 روتوں کے ساتھ ملتتی ہیں کب ہوائیں کہیں!
 فضا میں تیرتے رہتے ہیں نقش سے کیا کیا!
 مجھے تلاش نہ کرتی ہوں یہ بلائیں کہیں!
 ہوا ہے تیز، چراغ و فکا ذکر تو کیا
 طنائیں خیمہ جاں کی نہ ٹوٹ جائیں کہیں!

میں ادس بن کے گلِ حرف پر چمکتا ہوں
نکلنے والا ہے سُورج، مجھے چھپائیں کہیں!

مرے وجود پہ اُتری ہیں نَفِظ کی صورت
بھٹک رہی تھیں خلاؤں میں یہ صدائیں کہیں

ہوا کا لمس ہے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
شفق کی آنچ سے آنکھیں کھیل نہ جائیں کہیں!

رُکا ہوا ہے ستاروں کا کارواںِ امجد
چراغ اپنے لُہو سے ہی اب جلا میں کہیں

بام و در سے ہی بات کی جائے
رائیگاں کیوں یہ رات کی جائے!

پیا س پھر بستیاؤں میں اُتری ہے
گفتگوئے فرات کی جائے

پتھروں سے خطاب کیا کیجے
آدمی ہوں تو بات کی جائے

مٹھیاں کھل رہی ہیں غنچوں کی
کچھ سبیل ثبات کی جائے

✓ خاک کا سحر ٹوٹتا ہو جب
کیا بھری کاٹنات کی جائے!

۱۹۶۳

یا تو ترتیب دیں ستاروں کو
نختم یا کاٹنات کی جائے

آسماں دھم سے آگرے نیچے
خاک اگر بے صفات کی جائے

صبح کی آس ہے نہ شام کا غم
جیسے زنداں میں رات کی جائے

توڑ دیں حبال چاند تاروں کا
کوئی شکل نجات کی جائے

دسترس کے حصار سے آگے
سیر ناممکنات کی جائے

خاک کو خاک ہی میں ملنا ہے
کیوں حلاؤں کی بات کی جائے

زنجیرِ دزد ٹوٹ گئی ہے پہ قید ہوں
ہاتھوں میں ایک حلقہ پیمان رہ گیا

کساحل کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا چاند
پہنچا جو پانیوں میں تو حیران رہ گیا

آئی بہار، باغ کی مٹی ہری ہوئی
محب دگر وہ پیڑ کہ دیران رہ گیا

۱۹۷۳ء



آنکھوں میں باز دید کا ارمان رہ گیا
کیا چاند تھا کہ ہالہ حرمان رہ گیا

خالی گھروں میں جس طرح آسب سانس لے
دل میں کسی کا سایہ پیمان رہ گیا

منظر جو دل پسند تھے آگے نکل گئے
رستوں میں ایک دیدہ حیران رہ گیا

آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے مسافر گزر گئے
چپاں فصیل شہر پہ اعلان رہ گیا



ہر شخص کی نگوں رنگ تباہ ہے کہ نہیں ہے!
 قیتل گہراہل وفا ہے کہ نہیں ہے!
 محروم خواب آتی ہے فریاد فلک سے
 ان ظلم نصیبوں کا خدا ہے کہ نہیں ہے!
 اے قریہ بے خواب تمنا کے مینو
 اس راہ کا اُس کو بھی پتا ہے کہ نہیں ہے!
 اک ریت کا دریا سا ادھر بھی ہے ادھر بھی
 صحرائے محبت کا سرا ہے کہ نہیں ہے!



میں بے نوا ہوں، صاحبِ عزت بنا مجھے
 اے ارضِ پاک، اپنی جبین پر سجا مجھے
 جس پر رقم ہیں نقشِ کف پائے دستکوں
 اے عہدِ نامام، وہ رستہ دکھا مجھے
 میں حرفِ حرف لوحِ زمانہ پہ درج ہوں
 میں کیا ہوں! میرے ہونے کا مطلب سکھا مجھے
 یا مجھ کو اپنا چہرہ منزل نما دکھا
 یا قیدِ صبح و شام سے کر دے رہا مجھے
 میں موجِ شوقِ خام تھا لیکن ترے طفیل
 دریا بھی اپنے سامنے قطرہ لگا مجھے

آنکھوں کے لیے خواب میں شبنم کے لیے پھول
ہر چیز یہاں رشتہ بپا ہے کہ نہیں ہے!

اک نسل کی تعزیر ہمیں دوسری نسلیں
اے منصف برحق، یہ ہوا ہے کہ نہیں ہے!

بے رنگ ہوئے جلتے ہیں آنکھوں کے جزیرے
طوفان کی یہ آب ہوا ہے کہ نہیں ہے!

امجد جوڑ کا اس کی صدا پڑ نہ چلا پھر
انسان کا دل کوہِ ندا ہے کہ نہیں ہے!

۱۹۷۲ء



یہ دشتِ بھر، یہ وحشت، یہ شام کے ساتے
خدا یہ وقت تری آنکھ کو نہ دکھلائے!

اسی کے نام سے لفظوں میں چاند اترے ہیں
وہ ایک شخص کہ دیکھوں تو آنکھ بھر آئے

جو کھو چکے ہیں انھیں ڈھونڈنا تو ممکن ہے
جو جا چکے ہیں انھیں کوئی کس طرح لائے!

کلی سے میں نے گل تر جسے بنا یا تھا
رتیں بدلتی ہیں کیسے مجھے ہی سمجھائے

جو بے چراغ گھروں کو چراغ دیتا ہے
اُسے کہو کہ مرے شہر کی طرف آئے

یہ اضطرابِ مسلسل عذاب ہے امجد
مرا نہیں تو کسی اور ہی کا ہو جائے!

۱۹۷۲ء

کوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھسکتی آنکھوں کو سجانے نیکلے

دل نے اک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل (P)
تُو نے اک بات کہی، لاکھ فسانے نیکلے

کدشت تنہائی، بھراں میں کھڑا سوچتا ہوں
ہائے کیا لوگ مرا ساتھ نبھانے نیکلے

میں نے امجد سے بے واسطہ دیکھا ہی نہیں
وہ تو خوشبو میں بھی آہٹ کے بہانے نیکلے

۶۱۹۷۲

چاند کے ساتھ کئی درد پُرانے نیکلے
کتنے غم تھے جو ترے غم کے بہانے نیکلے

فصل گل آئی، پھر اک بار ایرانِ وفا
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نیکلے

ہجر کی چوٹ عجب سنگ شکن ہوتی ہے
دل کی بے فیض زمینوں سے خزانے نیکلے

عمر گزری ہے شربِ تار میں سکھیں ملتے
کس اُفتق سے مرا خورشید نہ جلانے نیکلے

✓ کوئی آہٹ تھی نہ پایا تھا

دل تو رکنے کا بہانہ چاہے

میں وہ رستے کی سرے ہوں جسے

✓ ہر کوئی چھوڑ کے جانا چاہے

✓ دیکھنا دل کی اذیت طلبی

پھر اسی شہر کو جانا چاہے

۱۹۶۰ء



✓ ترکِ اُلفت کا بہانہ چاہے

وہ مجھے چھوڑ کے جانا چاہے

آس کی خوابِ خیالی دیکھو

آگِ پانی میں رگنا چاہے

کچھ نہیں اور تعارف ہی سہی

آرزو کوئی ٹھکانہ چاہے

✓ وقت دیوار بنا بیٹھا ہے

وہ اگر ٹوٹ بھی آنا چاہے



یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لیا ہے

کسی کے ساتھ سہی وہ نظر تو آیا ہے

کروں شکایتیں، تکتا رہوں کہ پیار کروں

گئی بہار کی صورت وہ لوٹ آیا ہے

وہ سنا منے تھا مگر یہ یکتا نہ آتا تھا

وہ آپ ہے کہ میری خواہشوں کا سایا ہے!

غذاب دھوپ کے کیسے ہیں، بارشیں کیا ہیں!

فصیل جسم گری جب تو ہوش آیا ہے

میں کیا کروں گا اگر وہ نہ بل سکا احباب

ابھی ابھی مرے دل میں خیال آیا ہے



خزاں کے پھول کی صورت بکھر گیا کوئی

تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی

دروں دیرپوں میں خلقت دکھائی دیتی ہے

نواح سنگ ہیں آشفہ سر گیا کوئی

ہوا نہ تھا پہ ہواؤں سا بے خبر تھا وہ

مجھے بٹھا کے سر رہ گزر، گیا کوئی

گریز میں وہ توجہ کا رنگ کیسا تھا!

اس اک سوال سے دامن کو بھر گیا کوئی

اسے گماں ہی نہ تھا جیسے میرے ہونے کا

مرے قریب سے یوں بے خبر گیا کوئی

غم حیات کے رستے عجیب تھے امجد

کس نے ترک کے نہ دیکھا، کدھر گیا کوئی



پھول کو رنگ تارے کو ضیا کس نے دی!
اے غم دل ترے ہونٹوں کو نوا کس نے دی!

جی اُسے دیکھ کے کیوں آج بھرا آتا ہے
شعلہ عرض تمت کو ہوا کس نے دی!

دل کے دریا میں گیا جو بھی، وہیں ڈوب گیا
یہ مگر دھیان کی گلیوں سے صدا کس نے دی!

اپنی ہی شکل ہے، جس سمت نظر پڑتی ہے
شہر آئینہ میں آنکھوں کو منرا کس نے دی!

ہو ہوا اس کی ہی آواز لگی ہے! دیکھو
وادی سنگ میں امجد یہ نیدا کس نے دی!



اوروں کا تھا بیان تو موج صدا رہے
خود عمر بھرا سیر لپ تدار ہے

مثل حباب بحر غم حادثات میں
ہم زیر بار منت آب وہوار ہے

میں اُس سے اپنی بات کا مانگوں اگر جواب
لہروں کا تیج و حشم وہ کھڑا دیکھتا رہے

ق



گفتگو میں ایک بیک تبدیلی آواز کیا!
 خامشی میری ہے میرے درد کی غماز کیا؟
 دشت میں سیلاب ہے اور شہر ہیں تشنہ دہن
 دوستو، دید و رو، اس بات میں ہے راز کیا؟
 آدمی کیا، اب تو چلتے ہیں درد دیوار بھی
 بھاگیا شہروں کو تیری چال کا انداز کیا؟
 اس جہان کو روکتے میں خاک ہے عرض ہنر
 کیا دلِ الفتِ چشیدہ، رنگ کیا، آواز کیا؟
 یہ زمینیں بے ثمر ہیں، راستے بے نور ہیں
 کیا ہوائے موسم گل اور چشم باز کیا؟
 جس طرف چاہو، چلو امجد، ہوائے شوق میں
 کاروان بے جہت کے واسطے آغاز کیا! ۱۹۶۹ء

گلشن میں تھے تو رونقِ رنگِ چمن بنے
 جنگل میں ہم امانتِ بادِ صبا رہے
 سُرخ بنے تو خونِ شہیدان کا رنگ تھے
 روشن ہوئے تو مشعلِ راہِ و فارہے
 اُبھرے تو ہر بھنور کا جگر چاک کر گئے
 ٹھہرے تو موجِ موج کو اپنا بنا رہے
 امجد درنگار پہ دستک ہی دیجیے
 اس بے کراں سکوت میں کچھ غلغلہ ہے



ہم ہی آغازِ محبت میں تھے انجان بہت
 ورنہ نکلے تھے ترے وصل کے عنوان بہت
 آئینہ خانہ حیرت ہے کہ آئیب ہے وہ
 آنکھ میں رہ کے بھی کرتا ہے پریشان بہت
 دل بھی کیا چیز ہے اب پا کے اُسے سوچتا ہے
 کیا اسی واسطے چھانے تھے بیابان بہت
 اے غمِ عشق، مری آنکھ کو پتھر کر دے
 ہیں مرے سر پہ ترے اور بھی احسان بہت
 فاصلے راہِ تعشق کے مٹیں گے کیوں کر
 حسن پابندِ انا، عشق تن آسان بہت
 اس کو بھی لگ ہی شہرِ محبت کی ہوا
 وہ بھی امجد ہے کئی دن سے پریشان بہت



عشاق نہ پتھر نہ گدا کوئی نہیں ہے
 اب شہر میں سیالوں کے سوا کوئی نہیں ہے
 بچھڑے ہوئے لوگوں کا پتہ کون بتائے
 رستوں میں، بجز بادِ بلا کوئی نہیں ہے
 میں اپنی محبت میں گرفتار ہوا ہوں
 اس دزد کی قسمت میں دوا کوئی نہیں ہے
 بے بار چلا اب کے برس موسمِ گل بھی
 اُس چھول کے رکھنے کی ادا کوئی نہیں ہے
 ہر آنکھ میں افسوس نے جالے سے تنے ہیں
 ماحول کے جادو سے رہا کوئی نہیں ہے
 امجد یہ مراد دل ہے کہ صحرائے بلا ہے
 مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں ہے

جیسے میرا چہرہ میرے دشمن کا ہو
 آئینے میں خود کو ایسے دیکھ رہا ہوں

منظر منظر ویرانی نے جال تنے ہیں
 گلشن گلشن بکھرے پتے دیکھ رہا ہوں

منزل منزل ہول میں ڈوبی آوازیں ہیں
 رستہ رستہ خوف کے پہرے دیکھ رہا ہوں

شہر سنگدلاں میں امجد ہر رستے پر
 آوازوں کے پتھر چلتے دیکھ رہا ہوں

۱۹۶۹ء



خواب نگر ہے آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں
 اُس کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہوں

کس کی آہٹ قریب قریب پھیل رہی ہے
 دیواروں کے رنگ بدلتے دیکھ رہا ہوں

کون برے جادو سے بچ کر جاسکتا ہے!
 آئینہ ہوں، سب کے چہرے دیکھ رہا ہوں

دروازے پر تیز ہواؤں کا پہرا ہے
 گھر کے اندر چپ کے ساتھ دیکھ رہا ہوں

(نذرِ غالب)



دیکھتا رہتا ہوں میں جو کچھ پریشانی کرے
فیصلے جب دل کے ہوں تو کیا ہنزدانی کرے!

آنکھ میں منظر کا حبالا، کان میں گرجِ صدا
دشت کا ماحول پیدا خانہ ویرانی کرے
آرزو خود اپنے نگوں سے انجمن پرداز ہے

دل بہر قیمت فروغِ جلوہ سامانی کرے

ایک تو اس کی نگاہوں نے کیا بے دست چپا
اس پہ یہ مشکل کہ اپن دل بھی مانی کرے

سامنے آیا ہے تو میرے رگ چپے میں اتر
میں تو آئینہ نہیں جو صرف حیرانی کرے

کیا کہوں امجد ہوائے اضطراب دید کو
دشتِ دل کو ایک پل میں شہنمائی کرے



ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی
مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی

منزلِ تمت تک کون ساتھ دیتا ہے!
گردِ سعیِ لاحاصل ہر سفر کی قیمت تھی

آپ ہی بگڑتا تھا، آپ من بھی جاتا تھا
اس گریز پہلو کی یہ عجیب عادت تھی

اُس نے حال پوچھا تو یاد ہی نہ آتا تھا
کس کو کس سے شکوہ تھا، کس سے کیا شکایت تھی!



کون سی منزل پہ لے آئی اکائی ذات کی
ٹوٹ جاؤں گا اگر میں نے کسی بات کی

ٹوٹی کلیوں کے ماتم میں ہوا روتی رہی
پھول کے چہرے پہ لکھی ہے کہانی رات کی

ڈس گئیں میرے بدن کو رنگتیں تنہائیاں
کھا گئیں اس کو بلائیں گردشِ حالات کی

بند ہے آنکھوں میں منظر اس کے جاتے وقت کا
نقش ہے تصویرِ دل پر کپکپاتے ہاتھ کی

خامشی گویا ہوئی، منظر زبانیں بن گئے
کب مجھے کچھ ہوش تھا کب اُس نے کوئی بات کی!

دشت میں ہواؤں کی بے رُخی نے مارا ہے
شہر میں زمانے کی پُوچھ گچھ سے تحت تھی

یوں تو دن دھاڑے بھی لوگ ٹوٹ لیتے ہیں
لیکن اُن نگاہوں کی اور ہی سیاست تھی

ہجر کا زمانہ بھی کیا غضبِ زمانہ تھا
آنکھ میں سمندر تھا، دھیان میں وہ صورت تھی

شعبدہ بازی آئینہ احساس نہ پوچھ
حیرت چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے
دیکھتے خون کی برسات کہاں ہوتی ہے!
شہر پر چھپائی ہوئی سُرخ گھٹا ہے کب سے

کور چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم!
ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے

کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے امجد
ڈھونڈتی کس کو سر دشت ہوا ہے کب سے!

۱۹۶۸ء



دام خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی الجھن میں پڑا ہے کب سے
اے کڑی چُپ کے درو بام سجانے والے!
منتظر کوئی سر کوہِ ندا ہے کب سے

چاند بھی میری طرح حُسن شناسا نکلا
اُس کی دیوار پہ جیسا کہ کھڑا کب سے

بات کرتا ہوں تو نفلوں سے ہمک آتی ہے
کوئی انفاس کے پڑے میں چھپا ہے کب سے



بند تھا دروازہ بھی اور گھر میں بھی تنہا تھا میں
تُو نے کُچھ مجھ سے کہا یا آپ ہی بولا تھا میں؟

یاد ہے اب تک مجھے وہ بدحواسی کا سماں
تیرے پہلے خط کو گھنٹوں چومتا رہتا تھا میں

میری انگلی پر ہیں اب تک میرے دانتوں کے نشاں
خواب ہی لگتا ہے پھر بھی جس جگہ بیٹھا تھا میں

راستوں میں تیرگی کی یہ سنراوانی نہ تھی
اس سے پہلے بھی تمہارے شہر میں آیا تھا میں

آج آجہ خواب ہے میرے لیے جس کا خیال
کل اسی کا ہاتھ تھامے گھومتا پھر تاغیا میں



رات میں اس کشمکش میں ایک پل سویا نہیں
کل میں جب جانے لگا تو اُس نے کیوں روکا نہیں

یوں اگر سوچوں تو اک اک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنستا نہیں

کیوں اُڑاتی پھر رہی ہے در بدر مجھ کو ہوا
میں اگر اک شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ نہیں!

دُرد کا رستہ ہے یا ہے ساعتِ روزِ حساب
سینکڑوں لوگوں کو روکا ایک بھی ٹھہرا نہیں

شبِ بنی آنکھوں کے جگنو، کانپتے ہونٹوں کے پھول
ایک لمحہ تھا جو آج تک گزرا نہیں



میں ازل کی شاخ سے ٹوٹا ہوا
 پھر رہا ہوں آج تک بھٹکا ہوا
 دیکھتا رہتا ہے مجھ کو رات دن
 کوئی اپنے تخت پر بیٹھا ہوا
 چاند تارے دور پیچھے رہ گئے
 میں کہاں پر آگیا اڑتا ہوا
 بند کھڑکی سے ہوا آتی رہی
 ایک نشیہ تھا کہ میں ٹوٹا ہوا



سکون محال ہے امجد و فنا کے رستے میں
 کبھی چراغ جلے ہیں ہوا کے رستے میں؟
 نجانے اب کے برس کھیتوں پہ کیا گزریں!
 کئی پہاڑ کھڑے ہیں گھٹا کے رستے میں
 قدم قدم پہ قدم لڑکھڑائے جاتے ہیں
 بتوں کے ڈھیر لگے ہیں خدا کے رستے میں
 جہان نو کو شورِ مسافرت دیں گے
 ہم اپنے خون سے شمعیں جلا کے رستے میں
 دیارِ اہلِ محبت میں کس نے دی آواز
 ہزار ساز بکچے ہیں صدا کے رستے میں
 ۱ سوائے دردِ محبت، بجز غنبارِ سفر
 کوئی رشتہ نہیں پایا و فنا کے رستے میں

کھڑکیوں میں، کاغذوں میں، میز پر
سارے کمرے میں ہے وہ پھیلا ہوا

اپنے ماضی کا سمندر چھانیے
اک خزانہ ہے یہاں ڈوبا ہوا

A دوستوں نے کچھ سبق ایسے دیئے
اپنے سائے سے بھی ہوں سہا ہوا

کس کی آہٹ آتے آتے رُک گئی
A کس نے میرا سانس ہے روکا ہوا؟

۶۱۹۶۵